ڈاکٹر محمد اجمل

ترتیب وتعارف: خالد سعید

(ایک تمہید)

ڈاکٹر محمد اجمل

بیکن بُکس
BEACON BOOKS
• غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور فون: 042-37320030
• گلگشت ... فون: 061-6520790-6520791

انتساب

آرچل کے نام

فہرست

صفحہ نمبر

صفحہ نمبر

اظہارِ تشکر

ڈاکٹر محمد اجمل کی تصنیف "تحلیلی نفسیات" عرصہ دراز سے مارکیٹ میں موجود نہ تھی اور میرے انتہائی عزیز دوست ڈاکٹر لئیق مرزا، ڈاکٹر اظہر رضوی سابق صدر شعبہ نفسیات گورنمنٹ کالج لاہور اور ڈاکٹر محمد پرویز ڈائریکٹر انسٹیٹیوٹ آف سائیکالوجی اس انتہائی بیش قیمت کتاب کی فوری اشاعت چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں ناچیز نے ڈاکٹر محمد اجمل کے صاحبزادے محترم آسر اجمل سے رابطہ کیا اور انہوں نے کمال مہربانی سے کام لیتے ہوئے مجھے اس کتاب کی اشاعت کی اجازت عطا کر دی۔ میں ان سب احباب کا اور بالخصوص محترمی آسر اجمل کا شکر گزار ہوں۔ میں اپنے عزیز دوست غلام مصطفیٰ چودھری سابق وائس چانسلر کا بھی سپاس گزار ہوں کہ انہوں نے اس کتاب کے لیے ڈاکٹر اجمل کی شخصیت کے بارے میں انٹرویو دیا۔ اُن کا یہ انٹرویو شعبہ اطلاقی نفسیات کی اساتذہ اور میری عزیز از جان شاگردات محترمہ نگہت حیدر اور خدیجہ مفتی نے کیا۔ ان دونوں کا شکریہ ادا کرنا شاید میرے بس سے باہر ہے۔ میں جناب ڈاکٹر محمد امین چیئرمین شعبہ فلسفہ بہاؤ الدین زکریا یونیورسٹی ملتان اور ڈاکٹر محمد اظہر رضوی کا بھی شکر گزار ہوں کہ دونوں احباب نے مجھے ڈاکٹر اجمل کے بارے میں اپنے انتہائی وقیع مضامین اس مجموعہ میں شامل کرنے کی اجازت دی۔ میرے عزیز دوست اور سابق شاگرد جناب شوکت قادری خصوصی شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اس مسودہ کی پروف ریڈنگ کی لیکن احباب کی مساعی جمیلہ کے باوجود اگر اس کتاب میں کوئی خامی رہ جائے تو اسے ناچیز کی نااہلی پر محمول کیجیے۔

اور آخر میں انتہائی شکر گزار ہوں جناب چوہدری عبدالجبار اور جناب فیض محمد قریشی کا، کہ انہوں نے اس کتاب کی اشاعت کا اہتمام کیا۔

خالد سعید

شعبہ نفسیات

گورنمنٹ کالج ملتان

ڈاکٹر محمد اجمل

''وہ شخص پیکرِ صدق اور وہ فرد فیض رساں''

ایک انٹرویو جو نہ کیا جا سکا

تحریر: خالد سعید

''محبت ہی ایک ایسا جذبہ ہے جو ''انا'' کو ختم کرتا ہے اور ہمیں زندگی کے سمندر میں کودنے کی ہمت عطا کرتا ہے۔ یہی سمندر ہماری زندگی ہے اور ہماری موت، اور اس کے پانیوں سے تازہ دم ہو کر ہم تخلیق کر سکتے ہیں''

مقالاتِ اجمل: مرتب کردہ: شیما مجید
ڈاکٹر اجمل کے تحریر کردہ پیش لفظ سے ایک اقتباس

چوبیس جنوری انیس سو چورانوے یہ اُن کے شگفتہ دنوں کے آخری دن سے پورے ایک ہفتہ پہلے کا دن تھا۔ فون کی گھنٹی بجی اور جناب ڈاکٹر محمد امین [1] سے استاد محترم کی ملتان میں آمد کی خبر ملی۔ اور راقم الحروف محمد امین کی معیت میں زیارت استاد

---

(۱) ڈاکٹر محمد امین، ملتان کے شاعر، فلسفی اور نقاد، ڈاکٹر محمد اجمل، اُن کے ڈاکٹریٹ کے لئے لکھے جانے والے مقالے ''تصوف میں فرد کا تصور'' کے نگران تھے۔

کے لئے ملتان یونیورسٹی کے گیسٹ ہاؤس جا پہنچا۔ گیسٹ ہاؤس کے سبزہ زار میں استاد کامل مخدومی ڈاکٹر محمد اجمل تقریباً چودہ پندرہ اور شناسا، نیم شناسا اور ناشناسا چہروں کی سنگت میں موجود تھے۔ مانوس چہروں میں برادرم شہزاد قیصر کہ جنکے ڈاکٹریٹ کے مقالہ ''خواجہ فریدؒ، ایک مابعد الطبیعاتی مطالعہ'' کی جانچ لئے استاد محترم اسلام آباد سے اور ڈاکٹر عبدالخالق صدر شعبہ فلسفہ پنجاب یونیورسٹی لاہور سے تشریف لائے تھے، ڈاکٹر طاہر تونسوی (تب ناظم تعلیمات ملتان)، سعید انور (ٹریژرر ملتان یونیورسٹی) اور کریم ملک (پبلک ریلیشنز آفیسر ملتان یونیورسٹی) شامل تھے۔ نیم آشنا صورتوں میں ملتان یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر امتیاز نمایاں تھے۔ باقی چہروں کی ناشناسائی کو میرے طبعی اور سماجی مقیاس ذہانت کے محدود ہونے پر محمول کیجیے۔

سرما کی پہلی لرزتی ہوئی دھوپ اور تیز بے رحم ہوا میں خشک پتے اپنے مہربان درختوں سے ازلی جدائی کا بین کرتے ہوئے گذرے۔ میں نے ادب سے جھک کر اُن کے ساتھ مصافحہ کیا۔ اور اُن کے ہاتھ کے لمس میں تین تڑپتی، کلبلاتی اور پھسلتی ہوئی دہائیاں جیسے ایک لمحہ کے لئے قرار میں آگئیں۔ ''سر! یہ آپکا بہت پُرانا شاگرد ہے'' محمد امین نے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ نہ جانے جانے کا چرکہ بے دھڑک میری ''انا'' میں دراڑ ڈالتا ہوا نکل گیا۔ ''سر، دراصل میں نالائق ہی بہت تھا۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں انیس سو چونسٹھ سے انیس سو چھیاسٹھ تک آپ کا بے قاعدہ اور انیس سو چھیاسٹھ سے انیس سو ارسٹھ تک باقاعدہ طالب علم رہا ہوں۔ اُن دنوں آپ سے تاریخ نفسیات اور جنرل سائکالوجی پڑھی۔'' میں نے عدم شناخت کی شرمساری کو چھپانے کی ناکام سعی کرتے ہوئے کہا۔ اُن کے چہرے پر حوصلہ دلانے والی مخصوص مسکان کی تازہ سرسوں کھلی: ''نافرمان اولاد اور نالائق شاگرد کون بھول سکتا ہے؟'' وہ باتیں کرتے رہے، خواجہ فریدؒ، ابن عربیؒ، شاہ ولی اللہ، اشرف علی تھانویؒ، مارٹن لنگو، رینے گینوں، سقراط، یونیورسٹی کے نمو پذیر ہوتے ہوئے چمن، اس کے طرز تعمیر، اس کی تازگی اور کشادہ فضاء کے بارے میں .... میں انہیں دور بیٹھا دیکھتا رہا۔ اُن کے مطمئن چہرے پر مسلسل کئی پیکر نمودار ہوتے رہے۔ نٹ کھٹ بچے کا پیکر، دانا بزرگ کی تمثال، مادر مہربان کا

پیکر۔ پھر یکا یک یہ تینوں شبیہیں ایک دوسرے میں مدغم ہو کر محبوب کمسن کے پیکر میں ڈھل گئیں۔ ایک انجانے ڈر کا سیاہ چمکیلا پھن میرے زرد پڑتے ہوئے دل میں لہرا گیا۔

پچیس جنوری انیس سو چورانوے، سرکٹ ہاؤس، کمرہ نمبر سات، ''سر مجھے آپ کو انٹرویو کرنا ہے۔ کم سے کم چار گھنٹے آپ کو دینا ہوں گے۔ اور کوئی بات آف دی ریکارڈ بھی نہیں ہوگی۔ میں نے ماضی میں چھلانگ لگاتے ہوئے ساٹھ ۱۹۶۰ء کی دہائی کی ''ناراض نسل'' کے نوجوان کی مانند ضد کی۔ اور مطالبہ داغ دیا۔ اس امر واقعہ کو مطلقاً نظرانداز کرتے ہوئے کہ اب میری عمر اُس سے کہیں بڑی ہے جب پہلی بار میں نے انہیں انیس سو چونسٹھ میں گورنمنٹ کالج لاہور کی صد سالہ تقریبات میں سے ایک تقریب میں تقریر کرتے ہوئے سنا تھا۔ ''مگر مجھے تو آج ہی واپس جانا ہے۔ ملتان بے حد سادہ اور سنبھلا ہوا شہر ہے۔ ہر شہر کی بھی اپنی ایک شخصیت ہوتی ہے۔ اور یہ ایک ولی شہر ہے۔ اسکی کہنگی اور سنجیدگی میں ایک اسرار ہے۔ اور اس کے بھیدوں کی کھوج میں مارچ میں پھر یہاں آؤں گا۔ بہاء الدین زکریا اور رُکن الدین عالم کے مزاروں پر تو ہو آیا ہوں مگر موسم بہار میں شاہ شمسؒ کے مزار پر ''گِدا'' دیکھنے کا اپنا ایک لطف ہوگا اور تب تم جتنی دیر چاہے انٹرویو کر لینا۔'' ''مگر سر، مارچ تو بہت ہی دُور ہے، یوں کیجیے، مجھے اسلام آباد میں ہی ملاقات کا وقت دے دیجیے۔ میں وہیں حاضر خدمت ہوں گا۔'' انہوں نے اسلام آباد کا اپنا پتہ اور فون نمبر دیا اور ڈائری پر میں نے لکھا۔ ملاقات ڈاکٹر محمد اجمل، پانچ فروری، پانچ بجے سہ پہر، اسلام آباد۔ انہوں نے گفتگو جاری رکھی۔ ''آج میں مہر عبدالحق اور مرزا ابن حنیف سے ملا۔ مرزا صاحب کی تصنیفات تو میں نے دیکھی ہیں۔ مگر بگین بکس سے مہر صاحب کی کتاب ''ہندو صنمیات'' اب ہی ملی ہے۔ دلچسپ کتاب ہوگی۔ بلاشبہ مہر عبدالحق سے کہیں زیادہ .... یہ ملتان کے اکثر لوگ اتنے سنجیدہ اور پُرتکلف کیوں ہیں؟ حضور، سائیں، جناب کرتے کرتے بندے کا دم پخت کر دیتے ہیں۔ یہاں کوئی معروف ''توے باز'' بھی ہے؟'' سر آپ کو لاہور کا خالد عباس ڈار یاد آ رہا ہوگا۔ ملتان کی ایک معروف اور دلچسپ شخصیت سے آپ شاید نہیں ملے......... سید

حسن رضا گردیزی سرائیکی کے شاعر ہیں، مجید امجد کے قریبی دوستوں میں سے ہیں۔ بے حد بذلہ سنج اور شگفتہ، آپ اُن سے مل کر خوش ہوں گے .... وہ مسکرائے اور کہا کہ "اب آؤں گا تو اُن سے ضرور ملوں گا۔ یہاں میرا ایک پُرانا شاگرد بھی رہتا ہے۔ اگر ممکن ہو تو اُسے اسی وقت بلا دو۔" انہوں نے اس کا نام اور پتہ بتایا۔ فون کیا تو پتہ لگا کہ آج وہ ملتان میں موجود نہیں اور میں نے ڈاکٹر صاحب کو بتایا کہ انکے وہ شاگرد میرے فرسٹ کزن ہیں۔ وہ بے اختیار ہنسنے لگے ...... تو سنو ایک بار اُس نے شعبہ نفسیات کی ایک تقریب جسمیں کچھ فارن ڈیلی گیٹس بھی مدعو تھے، چائے میں جمال گوٹا ملا دیا۔ میری چائے تو خیر اُس نے کسی بہانے گرا دی مگر تم ذرا اُس منظر کا سوچو۔ سو سے زائد حاضرین جن میں زیادہ تعداد خواتین کی تھی اور صرف دو باتھ روم۔ بس لائن ہی لگ گئی۔ ابھی ہم اس صدمے سے بمشکل ہی سنبھل پائے تھے کہ اب کی بار اُس نے ایک اُستاد کی کلاس میں زندہ سانپ پھینک دیا۔ تھا تو وہ بے ضرر ہی۔ مگر بڑا تماشہ ہوا۔ خیر شعبہ نفسیات میں وہ سانپ میں نے محفوظ کرا دیا۔ ایک علامت کے طور پر۔ دراصل وہ ایک غفلت زدہ بچہ تھا اور توجہ کا طالب۔ اُس کے گھریلو حالات سے میں واقف تھا۔ یہ دراصل والد کے خلاف ردعمل تھا۔ اور اُس کی ماں اُس کے بچپن میں ہی انتقال کر گئی تھی۔ اور لوگوں کا روّیہ بھی شاید .... مگر نہیں تم تو اُس کے عزیز ہو اور اُس کے حالات سے واقف۔" وہ چپ ہو گئے۔ "اور سر کالج انتظامیہ اُسے سخت سے سخت سزا دینا چاہتی تھی مگر آپ اور ڈاکٹر نذیر احمد (معروف دانشور اور تب پرنسپل گورنمنٹ کالج لاہور) کی شفقت حسب معمول آڑے آئی۔ اب وہ یہاں وکالت کرتے ہیں۔ بے حد کٹر مذہبی اور سخت نیک ہو چکے ہیں۔ ہر ملنے والے سے اُن کا پہلا جملہ یہ ہوتا ہے "نماز پڑھ اس سے پہلے کہ تیری نماز پڑھی جائے"۔ سخت حیرت ہوتی ہے کہ کبھی وہ یہ سب کچھ بھی کرتے رہے ہیں۔" "مجھے تب بھی یقین تھا کہ بالآخر ایسا ہی ہو گا۔" اُن کی جانب سے مختصر تبصرہ آیا۔ "ڈاکٹر صاحب، لاہور کی ایک سائکالوجیکل کانگرس کے صدارتی خطبے میں آپ نے بتایا تھا کہ سائیکی کا ایک مطلب قدیم یونان کی دیو مالا میں "پاگل پن کی دیوی" بھی ہے اور [illegible] مختلف تھی۔ یہ حوالہ آپ نے کہاں سے

لیا تھا؟'' اُن کے ذہن کے بسیط آسماں میں اَن گنت دیویاں اور دیوتا اپنے اپنے مقام بدلتے رہے یکا یک مجھے وہ بے حد تھکے ہوئے اور بیمار لگے۔ اور وہ سوال جو مجھے اُن سے بہت پہلے کرنا چاہیئے تھا آخر میں کیا۔ اُن کی صحت کے بارے میں: ''کچھ عرصہ پہلے ایک تقریب میں یہ گفتگو کے لئے کھڑا ہوا۔ اور پھر مجھے یاد نہیں کہ کیا ہوا۔ خیر ایک ہفتے کے بعد ہوش تو آ گیا۔ مگر تب سے چلنے میں دقت ہوتی ہے۔ انگلینڈ میں چیک بھی کرایا۔ اللہ کا یہی بڑا شکر ہے کہ تھوڑا بہت اور سوچ سنبھل کر ٹانگیں چل تو پڑتی ہیں اور اس سے پہلے RETINAL DEGENERATION (آنکھ کے شبکیہ کے انحطاط) کے سبب ایک آنکھ میں بینائی نہیں۔ مگر دوسری آنکھ سلامت ہے۔ پڑھنے لکھنے کا کام جب ایک ہی سے چل جائے تو دوسری کی کمی نہیں محسوس کرنی چاہیئے۔ اقبال اور غالب پر دوبارہ لکھنا چاہتا ہوں میرا خیال ہے کہ اپنے ابتدائی مضامین میں میں نے اُن سے زیادتی کی تھی۔'' وہ خاموش ہوکر مسکرانے لگے اور حسب معمول مطمئن تھے۔ ''سر سگریٹ کے بغیر میرے لئے آپ کا تصور مکمل نہیں، لگتا ہے میں ابھی آپ سے ملا ہی نہیں۔'' ''تو لاؤ'' مگر میرے سے سگریٹ پرستن کو دیکھ کر انہیں مایوسی ہوئی۔ ''ہوش میں آنے کے بعد ڈاکٹروں نے زبردستی میرے سگریٹ چھڑا دیئے۔ اُن دنوں میں گولڈ لیف پیتا تھا۔ ساٹھ کی دہائی کا برانڈ تو اُس دہائی کے ختم ہوتے ہی بدل لیا تھا۔'' میں نے ایک دوست سے مطلوبہ سگریٹ مانگ کر اُن کی خدمت میں پیش کیا۔ کچھ دیر سگریٹ ان کے ہونٹوں کے ایک گوشے میں مانوس انداز میں لرزتا رہا۔ سرکٹ ہاؤس کے پورچ سے گاڑی کے ہارن کی آواز آئی۔ اُن کی واپسی کا وقت ہو گیا تھا۔ سرکٹ ہاؤس کے وسیع کار پورچ میں انہیں وداع کرتے ہوئے میرے کانوں میں بسم اللہ کی شہنائی گونجی .... ایک ابدی جدائی کی دُھن۔ مجھے لگا جیسے میں ایک بے حد بوڑھا، بیمار اور لاچار باپ ہوں جس کی اکلوتی بیٹی دُور بہت دُور اپنے پیا کے دیس سدھار رہی ہے۔ میرا دل رویا۔ لیکن میری آنکھوں میں آنے والے آنسو پلٹ گئے۔ شہنائی کی اداس دھن اور بلند ہوئی۔ اور انہوں نے مجھے انتہائی شفقت سے سینے سے لگاتے ہوئے کہا ''چیئر اَپ، پورا پروگرام بنا کر رکھنا۔ میں [illegible] بجے کی خبروں میں اس مختصر خبر کو سنتے ہوئے

میرے سامنے ایک جیون سے بھرپور ہمکتے ہوئے نوزائیدہ بچے کا مختصمثال ظاہر ہوا۔ اور میں مر گیا۔ مجھے کوئی افسوس نہ تھا کہ ایک مرا ہوا شخص اپنی موت کا ماتم کبھی نہیں کرتا۔ اور کمال مہربانی سے کام لے کر صدیوں کا سفر طے کرتے ہوئے شیراز کے حافظؒ نے اُن کے لئے کہا:

چناں زندگانی کن اندر جہاں
کہ چوں مردہ باشی نگویند کہ مُرد

پروفیسر ڈاکٹر محمد اجمل انیس سو انیس ۱۹۱۹ء میں پیدا ہوئے۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے ۱۹۳۹ء میں بی اے اور ۱۹۴۱ء میں فلسفہ میں ایم اے کیا۔ کچھ دیر گورنمنٹ کالج کیمبل پور (اَب اٹک) میں لیکچرر رہے۔ پھر ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے حصول کے لئے لندن چلے گئے۔ وہ بیک وقت اپنے عہد کے معلم اوّل، سماجی مفکر، ماہر نفسیات، صاحب اسلوب نثار، ادبی نقاد اور تصوف کے سب سے عمدہ شارح تھے۔ ۱۹۶۲ء سے ۱۹۷۰ء تک وہ گورنمنٹ کالج لاہور کے شعبہ نفسیات کے صدر رہے اور یہی وہ دور ہے جب علمی اور ادبی حلقوں میں اُنکی شخصیت ایک دیومالائی کردار کے طور پر اُبھری۔ اور جو آنے والے زمانوں میں اُسی طرح زندہ و قائم رہے گی۔ وہ ملک کے اہم انتظامی عہدوں پر بھی فائض رہے۔ مگر یہ اُن کی شخصیت کا ایک منفی پہلو ہے یا پھر ایک مجبوری کہ وہ قوانین وضوابط کی دنیا کے آدمی نہ تھے۔ خود اُن کے بقول ''یہ ضوابط ہر کسی کی تخلیقی صلاحیت کو ختم اور مسرت کو تباہ کر سکتے ہیں'' اور امر واقعہ یہ ہے کہ ان ضوابط کا فریضہ ہی یہی ہے اور شاید اسی لئے صوفیا کی اکثریت بالخصوص وحدت الوجودی صوفیا نے خود کو اس قوانین وضوابط کی دنیا سے الگ رکھا ہے۔ اُن کی ترک دنیا فرد (انسان) دشمن اداروں اور اُن کے ضوابط کو شعوری طور پر مسترد کرنا ہے۔ لیکن ڈاکٹر اجمل کی زندگی کا ایک دلچسپ (PARADOX) یہ تھا کہ وہ اِن اداروں سے وابستہ رہے۔ اگرچہ اس وابستگی کے باوجود اُن کا رویّہ اِن اداروں کے بارے میں منفی ہوتا تھا۔ پروفیسر اے ایچ علوی کے مطابق حکومت اور اختیار کی دنیا سے اُن کا براہ راست رابطہ ۱۹۶۱ء انیس سو اکسٹھ میں

ہوا جب اُس زمانے میں ملک کے صدر اور مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر محمد ایوب خان نے بظاہر عوام میں ''جذبہ حب وطنی'' کی افزائش اور ملک کے بارے میں مثبت روّیہ پیدا کرنے کے لئے ایک کمیٹی کی تشکیل دی۔ کمیٹی کے اراکین میں جناب قاضی اسلم، مسز رفیعہ حسن، پروفیسر اے ایچ علوی، ایم ایم احمد اور ڈاکٹر اجمل شامل تھے۔ لیکن کمیٹی کے ذمہ اصل فرض یہ تھا اور اس سے کمیٹی کے افتتاحی اجلاس میں ہی انہیں آگاہ کر دیا گیا تھا کہ:

(۱) عوام میں فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کا Image Develop کیا جائے تاکہ لوگ اُن (صدر) کا ادراک ایک سورما کے طور پر کریں۔

(۲) عوام میں اِس روّیہ کی تشکیل کی جائے کہ صرف مارشل لاء ہی ملک کی بقا اور سلامتی کا ضامن ہے۔

ہر حاکم اُن کی غیر معمولی ذہانت اور غیر متزلزل حس مزاح سے متاثر ہوتا اور یوں صدر ایوب سے لے کر جنرل ضیاء الحق تک سب سربراہان مملکت اُن کی صحبت سے استفادہ کرتے رہے۔ ذوالفقار علی بھٹو انہیں اس قدر پسند کرتے تھے کہ ایک زمانے میں وہ بیک وقت ناظم تعلیمات، پرنسپل گورنمنٹ کالج لاہور اور پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے۔ بعد ازاں انہیں فیڈرل سیکرٹری ایجوکیشن مقرر کیا گیا۔ انیس سو ستتر ۱۹۷۷ء میں مارشل لاء کے لفاذ پر انہیں معطل کر دیا گیا۔ غالبًا حاکموں نے انہیں اپنے اقتدار کے لئے ایک خطرہ سمجھا۔ لیکن ایک صوفی تو اِس دنیا کا آدمی ہی نہیں ہوتا۔ وہ کسی کے اقتدار کے لئے کیا خطرہ بن سکتا ہے۔ اسی لئے جب وہ ذاتی طور پر ضیاء الحق سے ملے تو نہیں ملازمت پر تو بحال کر دیا گیا مگر سیکرٹری تعلیمات کے عہدے پر برقرار نہ رکھا گیا اور اپنے ''انتظامی تجربات'' جو انہیں کبھی خوش نہ آئے، سے استفادہ کرتے ہوئے انہوں نے ''انسٹیٹیوٹ آف سائکالوجی'' کی بنیاد رکھی جس کے وہ پہلے ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ اور یہ وہ ادارہ ہے جس نے پاکستان میں اعلیٰ سطح پر نفسیات میں تحقیق کا اہم کام شروع کیا۔ [illegible] ''تحلیلِ نفسیات''، ''روزمرہ نفسیات'' اور شیما

مجید کا مرتب کردہ مضامین کا مجموعہ "مقالاتِ اجمل" شامل ہیں۔ انہوں نے وِل ڈیوراں کی کتاب (PLEASURE OF PHILOSOPHY) کا ترجمہ "نشاطِ فلسفہ" کے نام سے کیا۔ علاوہ ازیں انسٹیٹیوٹ آف سائکالوجی اسلام آباد نے انگریزی زبان میں اُن کے مضامین کا ایک مجموعہ "MUSLIM CONTRIBUTION TO PSYCHOTHERAPY & OTHER ESSAYS" کے عنوان سے انیس سو چھیاسی عیسوی میں طبع کیا۔ اُن کا مطالعہ حد درجہ وسیع تھا اور عمیق بھی۔ دنیا بھر کی دیومالا، لوک ادب، قدیم و جدید فلسفہ، نفسیات، ادب، شاعری، تصوف، الٰہیات اور یہ مطالعہ اُن کے لیکچرز، تقریروں اور تحریروں میں انتہائی شگفتہ اور تخلیقی انداز میں ظاہر ہوتا۔ اس امر میں کوئی کلام نہیں کہ اُن سے گفتگو یا اُن کا کوئی لیکچر، سامع یا طالب علم کو سو کتابوں کے مطالعہ سے بے نیاز کر دیتا تو ساتھ ہی اُنہیں اُس سے دوگنی کتابیں پڑھنے کی لگن پیدا کر دیتا۔ اُن کی شخصیت بے حد دلکش تھی۔ درمیانہ قد، گندمی رنگ، روشن فراخ جبیں، جھکے ہوئے کندھے، دھیمی پُر وقار چال، ہونٹوں میں ہمہ وقت دبا ہوا لرزاں سگریٹ، آنکھوں سے چھلکتی ہوئی ذہانت کی مے (اگر آپ رند ہیں تو اسے شرابِ رنگیں کے جام سمجھ لیں، اور اگر صوفی ہیں تو مے حقیقت) چہرے پر وہ ابدی اطمینان جو انہوں نے نہ جانے کن کٹھن منزلوں سے گزر کر حاصل کیا تھا۔ یورپ میں قیام کے دوران شدید ذہنی کرب کے باعث انہوں نے تحلیلِ نفسیات کے بانی اور معروف ماہر الٰہیات سی۔ جی۔ ژونگ C G Jung سے اپنا نفسیاتی تجزیہ کرایا۔ اور یہیں سے ژنگ کے ساتھ اُن کی عقیدت اور وابستگی کا آغاز ہوا جو اُن کی شخصیت میں گہرے طور پر رچ بس گیا تھا۔ اور اپنی انہی کیفیات کے تناظر میں انہوں نے تحلیلی نفسیات میں ایک جگہ لکھا:

> "اطمینان کا دروازہ بہت تنگ ہے اور کوئی شخص بھی روحانی
> اذیت سے گذرے بغیر اس میں داخل نہیں ہو سکتا۔"

اور پنجابی کے صوفی شاعر شاہ حسین لاہوری نے اسی خیال کو یوں نظم بند کیا ہے:

راہ عشق دا سوئی دا نکا

[illegible] تاں جاویں

سو نفسیاتی اطمینان، سکون کی کیفیت تپ اور کڑی ریاضتوں کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ خدا یا فطرت سے قربت کا حصول اس لئے بھی ایک دشوار مرحلہ ہے کہ جدید ٹیکنالوجی اور جدید ذرائع پیداوار اور اُن کی تقسیم کے نظام نے فرد کو اُس کے اندر اور باہر موجود فطرت سے بیگانہ کر دیا ہے۔

اُن کے لیکچرز اور گفتگو کا اسلوب، ورجینا وولف، ہنری جیمز اور قراۃ العین حیدر کے ناولوں کی سی فضاء پیدا کر دیتا۔ شعور کی رو چلتے چلتے لاشعور سے ہوتے ہوئے اجتماعی شعور، لاشعور تک جاتی اور پھر پلٹ کر اُن کے شعور کی گرفت میں آ جاتی۔ ساتھ ہی ساتھ ایک دلچسپ مکالمے اور سوال و جواب کی صورتحال چلتی رہتی۔ وہ ایک ایسے اُستاد تھے، جن کی شخصیت کا عکس بھرپور طریقے سے اپنے اردگرد ہر شئے کو متاثر کر دیتا ہے۔ ایک ایسی یکتا شخصیت، جیسے ابراہام ماسلو نے اپنے انٹرویو میں اپنے عظیم استادوں یرک فرام کیرن ہارنی، ہیری ہارلو اور رتھ بنی ڈکٹ کا ذکر کیا ہے۔ یہ بے حد محبت کرنے والے عالم اور متحمل مزاج لوگ تھے۔ غالباً انیس سو چھیاسٹھ کی بات ہے وہ ایک لیکچر کے دوران شراب نوش کی نفسیات بیان کرتے ہوئے کہہ رہے تھے کہ اسمیں صحبت ایک اہم عنصر کی حامل ہوتی ہے۔ شرابی ہمیشہ مخصوص محفل کا شائق ہوتا ہے۔ کلاس کے ایک طالب علم نے انتہائی بلند آواز اور بے ڈھنگے طریقے سے سوال کیا کہ ''ابو الکلام آزاد تو تنہائی میں پیتے تھے۔'' اور یہ بات اُس نے تین یا چار بار دہرائی۔ پوری جماعت پر سکتہ طاری ہو گیا۔ اس لئے بھی کہ حضرت ابوالکلام آزادؒ کی شخصیت سیاسی طور پر تو متنازعہ تھی لیکن دینی اور ادبی حلقوں میں وہ ایک غیر متنازعہ اور محترم شخصیت تھے۔ اور اُن کے بارے میں سوال کا یہ انداز تہذیب کے قرینے سے خارج تھا۔ پوری جماعت پہلی بار اپنے استاد کے جلالی پہلو کو دیکھنے کی منتظر تھی۔ تب انہوں نے ایک دھیمے تبسم کے ساتھ جواب دیا ''پیتے کہاں تھے وہ، وہ تو شراب کی بے حرمتی کرتے تھے'' اور یوں ایک ہی جملے سے پوری جماعت کے ذہن سے دباؤ دُور ہو گیا۔ اُن کی آواز پہلی سپتک کی کھرج سے دوسری سپتک کی کھرج کے درمیان ایک [illegible] چھو لیتی۔ اور اسمیں کے۔ ایل۔ سہگل، جگ

سوہنی اور پنج ملک کی آوازوں کا سا لوچ اور گہرائی ہوتی۔

وہ سائنس میں عام مروجہ دقیق اصطلاحات کے استعمال کو علم کے فروغ میں سب سے بڑی رکاوٹ خیال کرتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ اگر ان علوم میں اِن ادق اصطلاحات کا استعمال ترک کر دیا جائے تو علم بآسانی عام انسان کی پہنچ میں آ سکتا ہے اور عام انسان تک علم کی رسائی ہمارے معاشرے، اور لسانی، مذہبی، نسلی اور فرقہ وارانہ تعصب کی ماری ہوئی اِس دنیا کو تبدیل کر سکتی ہے۔ وہ خود دقیق فلسفیانہ، نفسیاتی اور دیگر علمی اصطلاحات اور تصورات کی وضاحت کے لئے تضمن سے نہیں بلکہ تعبیر سے کام لیتے تھے۔ لیکن علامت واضح ہو کر نئے حُسن معانی حاصل کرتی جیسے ایک روشن دن راکاپوشی یا ملکہ پربت کا عریاں حُسن ہمیں اور موہ لیتا ہے۔ وہ تنزیہہ اور تشبیہ کو یکجا کر کے بات کرنے میں خصوصی مہارت رکھتے تھے۔ اُن کے خیال میں ''اگر ہم بچوں اور وحشیوں کی طرح تعریف اشارہ کے اہل ہو جائیں تو مشاہدہ، تضمنی تعریف کی حدیں توڑ کر اپنے عمل میں ایک وحشی لذت و اہتزاز پیدا کرتا ہے۔'' کوئی بھی شخص اور خاص طور پر نفسیاتی مریض وحشت اور بچپن کے عہد سے گزرے بغیر اپنی شخصیت کی تعمیر نو نہیں کر سکتا۔ ہر لمحہ تخلیق کا لمحہ ہے اور ہر لمحہ موت کا، بقول شاہ حسینؒ:

''کہے حسین فقیر سائیں دا جیوندیاں جی مر رہیئے وو
نال سجن دے رہیئے وو''

تحریر میں اُن کا اپنا ایک خاص اسلوب ہے جو اپنی شگفتگی، روانی، سلاست اور ایک مستور ستم ظریفی (IRONY) اور بین السطور منطق کے استعمال کی وجہ سے یکتا ہے۔ مقالات اجمل کے ایک مضمون کا اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''انسان ایک معقول حیوان ہے۔ ارسطو کے نزدیک یہ سب انسانوں کا خاصہ ہے کہ وہ معقول حیوان ہیں۔ دو دن کا بچہ جس کا عمل فقط دودھ پینا، سونا اور رونا ہے۔ وہ بھی معقول حیوان ہے۔ بچے کی حیوانیت تو سمجھ میں آتی ہے۔ اس کے

معقول ہونے پر کافی سے زیادہ شک و شبہ کی گنجائش ہے۔
اسی طرح کم عقل لوگ، دیوانے اور سٹھیائے ہوئے بڈھے بھی
(بقول ارسطو) معقول حیوان ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ بڈھوں
کی عقل اور حیوانیت دونوں مشکوک ہیں۔''

اپنی کتاب تحلیل نفسی میں ایک جگہ پر انہوں نے ''علامت اور فردیت'' پر دلچسپ بحث کی ہے اور اس مسئلہ کو ایک نئے زاویے سے پرکھا ہے۔ علامت کے ضمن پر فرائڈ کا مؤقف تو واضح ہے کہ اُس کے مطابق اکثر نشانات اور بالخصوص جنسی افعال کے نشان تو جنسی محرک کی ہی نمائندگی کرتے ہیں۔ فردیت (INDIVIDUATION) ژنگ کی اصطلاح ہے۔ جس سے مراد وہ عمل ہے جسکے ذریعے فرد چار مخصوص ذہنی افعال، تفکر، وجدان، تحسسات اور احساس کے خاص امتزاج سے اور مختلف تجربات سے گذرتے ہوئے بالغ نظری حاصل کرتا ہے۔ ڈاکٹر اجمل نے دونوں تصورات کے باہمی تعلق کا جائزہ لیتے ہوئے کہا:

''علامت بندی کا عمل انسانی نفس کا اعلیٰ ترین وظیفہ ہے۔ اور
بعض اوقات جنسی افعال کے نشان، جنسی لذت کی سطح سے
ابھرنے کی علامت ہوتے ہیں۔ اساطیر اور صوفیائے کرام کی
وارداتوں میں ایسی تصویریں نمودار ہوتی ہیں جو منڈالا کی
طرح مدوّر یا مرجع ہوتی ہیں۔ جن میں ضدین کا اجتماع ہوتا
ہے۔ سورج اور چاند، آسمان اور زمین، شاہین اور اژدر یکجا
نظر آتے ہیں۔ اِن کا جذباتی تاثر ماورائی ہوتا ہے۔''

اسی طرح شخصیت کی تربیت کیا ہے؟ اور شخصیت کی صحیح تربیت کا نتیجہ کیا ہوتا ہے اِس موضوع کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے بے حد سُندر اور شاعرانہ تشبیہات سے کام لیا ہے:

''گردوہ اسکو وہی حاصل ہوتی ہے جیسے وہ چشمہ جو اپنے آپ

کو مختلف ندی نالوں میں منتشر کر رہا تھا۔ اپنا صحیح راستہ
دریافت کر لیتا ہے۔ اور جیسے ایک پتھر جو پھلتے ہوئے بیج پر
پڑا ہو ہٹ جائے تاکہ شگوفہ اپنی فطری نمو پائے۔"

سو اُن کے نزدیک شخصیت کی تربیت بھی دراصل اپنی اصل فطرت کو پانے کا دوسرا نام
ہے۔

کسی بھی معاشرت کے افراد کی نفسیات کو سمجھنے کے لئے وہاں کی لوک کہانیوں کا
مطالعہ اور تجزیہ بے حد ضروری ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر محمد اجمل کا مؤقف ملاحظہ کیجئے:

"لوک کہانیاں ایک حد تک ایک دوسرے سے مختلف ہوتے
ہوئے بھی مماثل ہوتی ہیں۔ زمانہ قدیم کے لوگ جو لوک
کہانیاں بیان کرتے ہیں اُن میں زمانی حد بندی غیر واضح
ہوتی ہے۔ زمانی حد بندیوں کا غیر واضح پن مختلف زمانوں کو
اِک دوجے میں ملا کر لوک کہانیوں میں ابدیت لاتا ہے۔
ہماری لوک داستان ہیر رانجھا میں، ہیر برتر اور مرکزی کردار
ہے۔ پورے قصے میں رانجھا صرف ایک مرتبہ ہیر پر غالب
آتا ہے۔ جب وہ ہیر کے احتجاج کے باوجود کیدو کے اِس
مشورے کو قبول کر لیتا ہے کہ اِن دونوں کو باقاعدہ نکاح کر
لینا چاہیئے۔"

لوک کہانیوں کے حوالے سے اپنے ادب کا تجزیہ کرتے ہوئے اُن کا نکتہ نظر یہ ہے کہ ہیر
ہماری شخصیت کا ایک حصہ ہے۔ جسے ہم نے شعوری طور پر مسترد کر رکھا ہے۔ یہی وجہ
ہے کہ دوسری اقوام کی نسبت ہم اکثر نسوانی دلفریبیوں کے سامنے جلد گھٹنے ٹیک دیتے
ہیں۔ عورت کی جانب ہمارا حقارت آمیز شعوری رویہ اس مکالمے کی راہ میں حائل ہو
جاتا ہے۔

ڈاکٹر محمد اجمل کے اس نکتہ نظر سے جزوا اختلاف کی جسارت کی جا سکتی ہے۔

ایک تو یوں کہ نسوانی دلفریبیوں کے آگے گھٹنے ٹیکنا غالباً ایک آفاقی عمل ہے۔ بقول میرؔ:

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میرؔ ہوئے
اُسکی زلف کے سب اسیر ہوئے

البتہ اُن کی یہ بات درست ہے کہ عورت کی جانب ہمارا یہ حقارت آمیز روّیہ تبدیل ہونا چاہیے۔ اس لئے کہ یہ روّیہ فرد کی شخصیت اور ہماری معاشرت ہر دو کی صحت مندانہ نشوونما میں حائل ہے۔

عورت کے بارے میں یہ منفی روّیہ ہمارے ادب میں بھی منعکس ہوتا ہے اور اپنے ایک مضمون ''اقبال ایک ماہر نفسیات کی نظر میں'' انہوں نے کہا کہ اقبال کے مردِ مومن میں جمالی پہلو کی نسبت جلالی پہلو زیادہ نمایاں ہے۔ اور پھر زیادہ صراحت سے یوں بیان کیا:

''اقبال کی شاعری میں ''عورت'' نہیں ہے۔ اقبال کی شاعری میں یہ ایک ایسا خلاء ہے جسے کوئی اور الوہیاتی یا ارضی ہستی پورا نہیں کر سکتی۔''

وہ بلاشبہ اپنے انتقال سے پہلے اقبال پر ایک اور مضمون لکھنا چاہتے تھے۔ اور اسمیں کلامِ اقبال کا زیادہ گہرائی اور گیرائی سے مطالعہ ہوتا۔ لیکن جہاں تک اقبال کے فن کے اس پہلو کا تعلق ہے کہ اُن کے ضخیم دیوانوں میں ''عورت اور مرد'' کے بنیادی تعلق کا سرسری حوالہ بھی موجود نہیں۔ ایک ایسا اعتراض ہے جو آج بھی اپنی جگہ وزن رکھتا ہے۔

اپنے ایک اور مضمون ''علامت پسندی اور ادب'' میں انہوں نے شعری واردات اور صوفیانہ و مذہبی واردات کے درمیان پیچیدہ تعلق کو موضوعِ سخن بنایا ہے۔

''تمام خالص شعری وارداتیں مذہبی وارداتوں کے قریب ہوتی ہیں۔ لیکن حقیقت کے بارے میں شاعر کا روّیہ جمالیاتی ہوتا ہے مذہبی نہیں۔ مگر جس رفعت کو شاعری چھونے کا حوصلہ

ایک تو یوں کہ نسوانی دلفریبیوں کے آگے گھٹنے ٹیکنا غالباً ایک آفاقی عمل ہے۔ بقول میر:

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میؔر ہوئے
اُسکی زلف کے سب اسیر ہوئے

البتہ اُن کی یہ بات درست ہے کہ عورت کی جانب ہمارا یہ حقارت آمیز روّیہ تبدیل ہونا چاہیئے۔ اس لئے کہ یہ روّیہ فرد کی شخصیت اور ہماری معاشرت ہر دو کی صحت مندانہ نشوونما میں حائل ہے۔

عورت کے بارے میں یہ منفی روّیہ ہمارے ادب میں بھی منعکس ہوتا ہے اور اپنے ایک مضمون ''اقبال ایک ماہر نفسیات کی نظر میں'' انہوں نے کہا کہ اقبال کے مرد مومن میں جمالی پہلو کی نسبت جلالی پہلو زیادہ نمایاں ہے۔ اور پھر زیادہ صراحت سے یوں بیان کیا:

''اقبال کی شاعری میں ''عورت'' نہیں ہے۔ اقبال کی شاعری میں یہ ایک ایسا خلاء ہے جسے کوئی اور الوہیاتی یا ارضی ہستی پورا نہیں کر سکتی۔''

وہ بلاشبہ اپنے انتقال سے پہلے اقبال پر ایک اور مضمون لکھنا چاہتے تھے۔ اور اسمیں کلامِ اقبال کا زیادہ گہرائی اور گیرائی سے مطالعہ ہوتا۔ لیکن جہاں تک اقبال کے فن کے اس پہلو کا تعلق ہے کہ اُن کے ضخیم دیوانوں میں ''عورت اور مرد'' کے بنیادی تعلق کا سرسری حوالہ بھی موجود نہیں۔ ایک ایسا اعتراض ہے جو آج بھی اپنی جگہ وزن رکھتا ہے۔

اپنے ایک اور مضمون ''علامت پسندی اور ادب'' میں انہوں نے شعری واردات اور صوفیانہ و مذہبی واردات کے درمیان پیچیدہ تعلق کو موضوعِ سخن بنایا ہے۔

''تمام خالص شعری وارداتیں مذہبی وارداتوں کے قریب ہوتی ہیں۔ لیکن حقیقت کے بارے میں شاعر کا روّیہ جمالیاتی ہوتا ہے مذہبی نہیں۔ مگر جس رفعت کو شاعری چھونے کا حوصلہ

کر سکتی ہے اُس تک وہی شاعر پہنچ سکتا ہے جو اخلاقی اور
مذہبی واردات سے گہرا سروکار رکھتا ہو۔''

امر واقعہ یہی ہے کہ شاعر، صوفی اور ماہر طبیعیات بھی ایک ہی ناقابل گرفت حقیقت کو گرفت میں لانے کی سعی کرتے ہیں۔ تمثالیں اُن کے باطنی تجربات میں تشبیہ اور استعارے کی صورت میں ڈھل کر نکلتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر صوفیاً نے انتہائی عمدہ شاعری کی ہے۔ اور ایک ایسی شاعری جس نے بیک وقت لوگوں کے جمالیاتی ذوق اور اخلاق کی تربیت کی ہے۔ اور اسی طرح بیشتر شعرا جو عملی صوفی نہیں بھی ہیں بالآخر تصوف کی طرف جا نکلتے ہیں۔ اگرچہ یہ کوئی حتمی کلیہ نہیں۔ غالب اِس سے اسثنیٰ کی سب سے بڑی مثال ہے۔ ادب ڈاکٹر محمد اجمل کا پسندیدہ موضوع تھا۔ خود انہوں نے گورنمنٹ کالج لاہور میں اپنے زمانۂ طالب علمی میں شاعری بھی کی لیکن وہ تخلیق ادب میں کسی طرح کی منصوبہ بندی کے قائل نہ تھے۔ یوں بھی ادب کا مرکزی نقطہ نظر تو کہانی ہی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ کہانی، نظم، غزل، افسانہ، ناول، تصویر، فلم، ڈرامہ جو چاہے صورت اختیار کر لے۔ کہانی دراصل تخیل کے اُڑن کھٹولے پر ایک زماں و مکاں سے دوسرے زماں و مکاں کا سفر ہے۔ کہانی کا زیادہ تر تعلق ماضی کے تجربات سے مگر کبھی کبھار مستقبل سے بھی ہو سکتا ہے۔ مگر اُس کا بیان ہمیشہ زمانہ حال میں ہوتا ہے اور یہ کہانی کا ایک دلچسپ دبدھا (PARADOX) ہے۔ سو ہر ادیب حال مست ہے۔ صوفیاً بھی حال مست ہوتے ہیں۔ اور سماع کے قائل تو قوالی کے دوران ''حال کھیلتے'' بھی ہیں۔ ادب اور تصوف کی یہ ''حال مستی'' اسمیں کسی طرح کی منصوبہ بندی کو ناممکن بنا دیتی ہے۔
''ادب اور منصوبہ بندی'' کے موضوع پر اُن کی تحریر کا یہ اقتباس دلچسپی سے خالی نہیں:

''منصوبہ بندیوں کے فریب کو سمجھ کر اُن سے آزاد ہو کر ہی
تخلیقی عمل بروئے کار آتا ہے۔ یہ عمل حال کا عمل ہے اس کے
لئے شعوری کوشش نہیں ہو سکتی کہ یہ انتظار دستوئیفسکی کے
''احمق'' (IDIOT) پرنس مشکن کا ہے۔ احمق ہیرو نے محبوبہ سے

ایک باغ میں ملاقات کا وعدہ کیا تھا۔ محبوبہ حسب روایت
محبوبی دیر سے پہنچی تو دیکھا کہ عاشق ایک بنچ پر پڑا سو رہا ہے
لڑکی نے عالمِ جلال میں اُسے جھنجوڑ کر بیدار کیا اور کہا کہ
''انتظار کا یہ اچھا طریقہ ہے؟'' اور احمق عاشق نے جواب دیا
''کیا انتظار کا اِس سے بہتر طریقہ بھی ہو سکتا ہے۔''

سچا ادب اُن کے خیال میں انتظار ہے۔ اُس پل کا جسمیں فن پارہ بے ساختگی سے خود کو ادیب پر منکشف کرتا ہے۔

ڈاکٹر اجمل فطرت کو مسخر کرنے کے جدید روّیہ کو خطرناک سمجھتے تھے۔ اور اِسے ہماری جملہ ذہنی الجھنوں اور ماحولیاتی مسائل کا سبب گردانتے تھے۔ اُن کے خیال میں فرد کو فطرت کے ساتھ ایک آہنگ میں آنا چاہیئے۔ فطرت جو خود فرد کے باطن میں موجود ہے۔ میراں بائی کے شبدوں میں:

گھونگٹ کے پٹ کھول دی
توہے پیا ملیں گے

اِسی کو انہوں نے قربِ خداوندی اور ذہنی صحت قرار دیا۔ یوں تو ابن عربیؒ کے مطابق ''حق تعالیٰ ہر فرد کو اُس کے ظرف کے مطابق ملتا ہے۔ لیکن ظرف میں تنگی اور کشادگی کا انحصار خود اُس کی استطاعت پر ہے۔'' اس لحاظ سے ذہنی صحت کی ذمہ داری تو خود فرد کی ہے۔ لیکن اگر وہ خود ہر ذمہ داری پوری نہ کر سکے تو وہ ''مرشد'' (معالج) سے رہنمائی حاصل کر سکتا ہے۔ اور اِس ضمن میں ''مرشد'' (معالج) پر لازم ہے کہ بات خلق خدا کی عادات، رسم و رواج اور زبان کے مطابق کی جائے تا کہ ابلاغ میں سہولت ہو اور ظرف میں مطلوبہ کشادگی پیدا ہو سکے۔

ڈاکٹر اجمل کے بہت سے نظریات سے اختلاف ممکن ہے۔ مثلاً مغرب کے اندازِ فکر کو تحلیلی اور مشرق کے مزاج کو ترکیبی سمجھنے پر۔ امر واقعہ یہ ہے کہ مغرب میں بھی بہت سے ترکیبی مزاج کے حامل لوگ مل جاتے ہیں۔ اور مشرق میں بھی تحلیلی اندازِ فکر

رکھنے والوں کی بھی کمی نہیں۔ مگر اس استدلال سے قطع نظر اصل بات یہ ہے کہ انسانوں کی کسی بنیاد پر بھی تقسیم کا روّیہ، بذاتِ خود ایک خطرناک روّیہ ہے۔ اسی طرح اُن کی جانب سے حسن عسکری کی آخری دو کتابوں کا دفاع بھی ناقابلِ فہم ہے۔ بلاشبہ حسن عسکری اُن کے دوست تھے اور اردو ادب کے بے حد اہم اور تخلیقی نقاد۔ مگر جس طرح انہوں نے اپنی اُن دو کتابوں میں صرف ''مغربی گمراہیوں کی تاریخ'' بیان کی ہے، اور اُس کے نتیجے میں مشرق میں پیدا ہونے والے مغالطوں کا ذکر کیا ہے وہ ایک انتہا پسندانہ نکتہ نظر ہے۔ ''مغرب'' کی کلی مذمت کے جوش میں انہوں نے ڈاکٹر اجمل کی پسندیدہ کتاب ''ورائٹیز آف ریلیجس ایکسپیرینس'' (VARIETIES OF RELIGIOUS EXPERIENCE) مصنفہ ولیم جیمز کو بھی نہیں بخشا۔ اسمیں بھی اصل بات یہ نہیں کہ کتاب پر تنقید کی گئی ہے۔ تنقید کا حق تو ہر شخص کو حاصل ہے۔ لیکن کسی بھی نکتہ نظر کا غیر مشروط اور کلی استرداد ایک منفی روّیہ ہے جو معاشرے میں بیمار رجحانات کی نشو ونما کرتا ہے۔

مگر جہاں تک ڈاکٹر اجمل کی اپنی ذات کا تعلق ہے وہ بنیادی طور پر ایک روشن خیال اور وسیع القلب شخص تھے۔ اور آزادیٔ فکر کے دل سے قائل۔ ساٹھ کی دہائی کے ابتدائی برسوں کا ذکر ہے کہ اقبال پر ایک بظاہر قابلِ اعتراض مضمون کی اشاعت کے بعد مضمون کے مصنف پروفیسر جی۔ ایم۔ اثر کا گورنمنٹ کالج لاہور سے دُور دراز علاقے کے کسی کالج میں تبادلہ کر دیا گیا۔ ڈاکٹر اجمل اِس ناواجب انتظامی کارروائی سے بے حد آزردہ ہوئے اور اپنے طور پر انہوں نے اس تبادلہ کی منسوخی کے لئے کوشش بھی کی۔ مگر اسمیں ناکام رہے۔ وہ ملک میں تنگ نظری، تعلیمی عدم آزادی اور عدم رواداری کے بڑھتے ہوئے رجحان سے خوفزدہ تھے۔ اسی طرح جب انیس سو انہتر ۱۹۶۹ء میں پروفیسر ایرک سپرین، پروفیسر منظور احمد اور پروفیسر امین مغل کو اُن کے نظریات اور ٹریڈ یونین سرگرمیوں کی بنا پر اسلامیہ کالج لاہور سے نکالا گیا تو انہوں نے اس اقدام پر نہ صرف یہ کہ اظہار ناپسندیدگی کیا بلکہ اُس وقت جب اُن دانشوروں کے بعض قریبی احباب بھی اُن سے سماجی روابط رکھنے سے کترانے لگے تھے انہوں نے مسلسل اُن سے رابطہ رکھا اور ممکن حد تک اُن کی تالیفِ قلب کی۔ اُس سخت دور میں یہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ اُن کی

ظاہری وضع قطع بے شک صوفیوں جیسی نہ تھی مگر انسانی فطرت کے بارے میں اُن کا بنیادی نکتہ نظر صوفیانہ تھا: ''خدا ہماری ضرورت ہے۔ اور اُس سے مکالمہ ممکن ہے۔'' اور ''ہمارے ادراک کے اعمال اور افکار کی سمت بھی ہماری آرزوں اور تمناؤں سے متعین ہوتی ہے۔'' بحوالہ فکر اسلام اور اقبال اور اِس تصور کی وضاحت کے لئے انہوں نے عرفی کا یہ مشہور زمانہ شعر نقل کیا ہے:

ز نقصِ تشنہ لبی داں بعقل خویش مناز
دلت فریب گر از جلوۂ سراب نخورد

[اگر تمہیں صحرا میں دُور سے چمکتی ہوئی ریت ندی نظر نہیں آئی تو یہ نہ سمجھو کہ تم زیادہ عقل مند ہو بلکہ یہ کہ تمہاری پیاس میں ضرور کمی رہ گئی ہے]

اسی لئے وہ ہر مذہب، ملک اور مکتبہ فکر کا احترام کرتے تھے۔ سگمنڈ فرائڈ کے نظریات سے شدید اختلافات رکھنے کے باوجود اُسے اِن الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا:

''ایک عظیم ذہن کی غلطیاں ایک معمولی ذہن کی صحیح باتوں سے کہیں زیادہ اہم ہوتی ہیں۔''

بہت بڑا دل اور جگرا چاہیئے۔ اپنے کسی نظریاتی مخالف کے لئے ایسا جملہ لکھنے کو۔ لیکن اُن میں یہ حوصلہ بدرجہ اُتم موجود تھا۔ اور اُن کے اَن گنت چاہنے والوں کے اُن کے بارے جذبوں اور خیالوں کو مجید امجد نے یوں صورت پذیر کیا ہے:

ہمیں نے دیکھا ہے اُس کو، ہمیں خبر ہے وہ شخص
دلوں کی روشنیاں تھا - دلوں کی زندگیاں

ڈاکٹر محمد اجمل اور نفسیاتی تنقید

(ڈاکٹر محمد امین)

ڈاکٹر محمد اجمل ہمارے عہد کے بڑے عالم فاضل اور بہت ہی پڑھے لکھے انسان تھے۔ کتاب سے انہیں خاص انس تھا۔ ان کا مطالعہ بڑا وسیع اور گہرا تھا۔ فلسفہ، نفسیات، تصوف، مذہب اور ادب ان کے خاص موضوعات مطالعہ تھے۔ کتاب بینی کا شوق حد سے زیادہ تھا۔ اس عمر میں بھی جب ایک آنکھ کی بینائی ختم ہو چکی تھی اور دوسری آنکھ کی بینائی بہت کمزور تھی مطالعے کا شوق کم نہ ہوا۔ ملتان تشریف لائے تو یہاں بھی کتابیں دیکھنے کی آرزو کی اور چند کتابیں خرید لیں۔ زندگی نے انہیں ان کتابوں کو پڑھنے کی فرصت نہیں دی۔ اور وہ ملتان سے واپسی کے بعد جلد ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔

ان کی گفتگو علم کا خزانہ تھا وہ ایسی گفتگو کرتے تھے جیسے علم کا دریا بہہ رہا ہو۔ افسوس انہوں نے کم لکھا ہے اور بہت کچھ فرمائشی اصرار پر لکھا ہے۔ ان کی ہر تحریر سے علم کا بھرپور اظہار ہوتا ہے۔ ہر سطر سے مترشح ہوتا ہے کہ جیسے کوئی بڑا عالم لکھ رہا ہو۔ مشرقی لوک ودیا کی تاریخ میں مشرقی حکمت اور ذہانت کا اظہار گفتگو اور مجلسی تقریروں ہی میں ہوا ہے۔ صوفیاء نے بہت کم لکھا ہے ان کی گفتگو کو محفوظ کیا گیا ہے۔ اکثر صوفیاء کے ملفوضات ہی مشہور ہیں۔ چونکہ ڈاکٹر اجمل کو بھی تصوف سے گہری دلچسپی تھی۔ اس لیے شاید ان کے مزاج پر صوفیاء کی اس روش کا گہرا اثر ہو۔ میرے خیال میں اس کے کچھ معروضی اسباب بھی ہیں۔ کیونکہ ہمارے عہد کی بہت سے شخصیات کے بارے میں یہی کہا جاتا ہے۔ مثلاً فیض احمد فیض کے بارے میں بھی کہا جاتا ہے کہ وہ جس پایہ کی ذہانت اور علم کے حامل تھے اس کا بہت کم حصہ ان کی تخلیقات میں ظاہر ہوتا ہے اور

انہوں نے بھی اپنے قد سے کم کام کیا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ علم دشمن اور علم ناشناس معاشرے میں رہنے والے اہل دانش کو اس مسئلے پر ضرور سوچنا چاہیے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ فطرت ہمیں علم کی روشنی سے محروم کر دے اور فطرت کے قوانین اٹل اور ناقابل تغیر ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر اجمل نے تراجم کئے۔ انگریزی اور اردو میں مضامین لکھے۔ کتابوں کے علاوہ مضامین بھی کتابی صورت میں چھپ چکے ہیں۔ جس طرح ان کی گفتگو میں فلسفہ و نفسیات، تصوف و مذہب اور ادب یکجا ہو جاتے تھے اسی طرح ان کے مضامین میں بھی یہ علوم یکجا ہو گئے ہیں۔ انہوں نے اکثر مضامین میں اختصار سے کام لیا ہے۔ جب کہ بعض جگہ قاری تفصیل کا تقاضا کرتا ہے۔ اس کا ایک سبب ان کی منصبی ذمہ داریاں بھی ہو سکتی ہیں جس کی وجہ سے وہ بہت مصروف رہتے تھے۔

ان کے ادبی مضامین میں اہم اور قومی حوالہ نفسیات کا ہے۔ وہ اردو کے پہلے ناقد اور ادیب ہیں جنہوں نے نفسیات کا باقاعدہ مطالعہ کیا ہے۔ انہیں یونگ سے بڑی دلچسپی تھی وہ یونگ کے نظریات و افکار کے بڑے حامی تھے۔ یونگ ہی کو انہوں نے ادبی حوالہ بنایا ہے حسن عسکری بھی ان کی نفسیات دانی کے معترف تھے۔ اردو تنقید میں اہمیں حسن عسکری اور ڈاکٹر اجمل میں مماثلت نظر آتی ہے۔ دونوں تصوف اور نفسیات میں گہری دلچسپی رکھتے تھے اور تنقید میں ان علوم کو حوالہ بناتے ہیں۔ دونوں مولانا اشرف علی تھانوی صاحب کی علمیت کے قائل ہیں۔ ڈاکٹر اجمل نے ''محمد حسن عسکری کی دو کتابیں'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے جس میں حسن عسکری کے تبحر علمی اور کام کی لگن کی تعریف کی گئی ہے۔

ڈاکٹر اجمل کے خیال میں تخلیق شعور اور لاشعور کے وصال سے جنم لیتی ہے۔ اس بات پر غور کرنے سے معانی کی بہت سی تہیں کھلتی ہیں۔ تخلیق فن کی نفسیات کے بارے میں چند ماہرین نفسیات نے تحقیق سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ فنکار جب شخصی تعلقات قائم کرنے اور بنانے میں ناکام یا معذور رہتا ہے تو فن کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اس [illegible] اجمل نے قطع رائے دی ہے۔ لکھتے ہیں ''یہی حالت اکثر فنکاروں کی ہے۔

لاشعوری طور پر وہ رابطہ کی خاطر ہی فن تخلیق کی طرف رجوع کرتے ہیں لیکن جب واہمے اور تخیل کا سیلاب الڈتا ہے اور ان میں جذبات سے سرشار اعیان تعدی اور جارحانہ آمیزش کے ساتھ ابھرتے ہیں تو وہ فنکار یہ محسوس کرنے میں عافیت پاتے ہیں کہ یہ ان کی اناکی تخلیق ہیں ان کی غیر انانیت کو نہیں پہچانتے اور اس طرح گریزاں تخیل اور خود پسندی کے ذریعے شخصی تعلقات قائم کرنے کے امکانات کمتر کر دیتے ہیں۔"

یعنی جس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے وہ فن کی طرف رجوع کرتے ہیں عملی زندگی میں اس کے امکانات اور محدود ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر اجمل کا تجزیہ یہ ہے کہ جو فنکار شخصی تعلقات میں ناکامی کے سبب فن کی طرف رجوع کرتے ہیں ان کے لیے تخلیق فن کے بعد شخصی تعلقات قائم کرنے کے امکانات اور بھی محدود ہو جاتے ہیں۔ یہ تجزیہ اردو کے کئی شعراء پر صادق آتا ہے۔

ادب میں علامت نگاری کا مسئلہ بھی بڑا اہم ہے۔ ڈاکٹر اجمل نے اسے بھی نفسیاتی حوالے سے دیکھا ہے ان کے نزدیک علامت ترفع کا وسیلہ ہے۔ "علامت ایک وسیلہ ہے جو جنسی قوت کو روحانی قوت میں تبدیل کرتا ہے۔" ان کے خیال میں "ہر خالص شعری واردات علامتی ہوتی ہے۔ وہ شعوری رویے اور لاشعوری رویے کے مابین واسطے کا کام انجام دیتی ہے۔ شعور ایک سوال پوچھتا ہے اور جواب میں لاشعور کوئی علامت یا علامتوں کا کوئی سلسلہ جس کا اساطیر اور لوک ودیا میں اظہار ہوا ہو، فراہم کر دیتا ہے۔ نخستمثال شکلوں کا حامل لاشعور علامتوں کے ہی ذریعے سے بہترین طور پر اپنا اظہار کر سکتا ہے۔" یہ تو نفسیاتی عمل ہے کہ لاشعور علامتوں میں اظہار پاتا ہے لفظوں کی صورت میں علامت کیا ہے۔ نشان اور علامت میں فرق بیان کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"نشان اور علامت میں یہ فرق ہے نشان کا کام محض نمائندگی کرنا ہے لیکن علامت کسی نامعلوم شے کا بہترین اظہار ہونے کی بناء پر ماہیت کو بدل ڈالتی ہے۔ لہذا علامت دو سطحوں کے مابین واسطے کا کام کرتی ہے یعنی شعور کی اور لاشعور کی سطح۔" اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ علامت اور شخصیت کا گہرا تعلق ہے علامت شخصیت کی عکاسی کرتی ہے۔ "ہر علامت ایک کوکبہ بناتی ہے۔ اس کوکبے پر غور و فکر کرنے سے اس علامت کی توانائی

شخصیت میں رس بس جاتی ہے۔'' علامتوں کے مطالعے سے شخصیت کی گتھی بھی سلجھائی جا سکتی ہے۔ ڈاکٹر اجمل کے اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے کہ علامت ترفع کا ذریعہ ہے۔ علامت شعور اور لاشعور کے درمیان واسطے کا کام دیتی ہے۔ اور علامت سے شخصیت کی تفہیم میں بھی مدد ملتی ہے۔

ادب میں زمانے کا مسئلہ بھی خاصی اہمیت کا حامل ہے یہ سوال کہ ادب کو صرف ماضی اور حال کا ذکر کرنا چاہیے یا مستقبل کے بارے میں بھی آگاہ کرنا چاہیے۔ ڈاکٹر اجمل نے ''ادب میں ماضی، حال اور مستقبل'' میں اس مسئلے کو فلسفیانہ انداز میں حل کیا ہے۔ وہ رقم طراز ہیں۔ ''اچھے ادب میں ماضی، حال اور مستقبل کے علاوہ ایسی بصیرتیں بھی ہوتی ہیں جو ماضی، حال اور مستقبل سے ماوراء ہوں اور ان کی نوعیت دائمی ہو جن میں ماضی، حال اور مستقبل ہم زمان ہوں۔ ماضی، حال اور مستقبل میں اسی طرح واضح امتیاز کرنا سائنسی طریق کار ہے۔ عظیم ادب میں ماضی اور مستقبل حال بن جاتے ہیں اور عظیم ادیب حال مست ہوتا ہے۔'' ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ڈاکٹر اجمل کی رائے میں ادب دائمی اقدار کا پرچار کرتا ہے اس لیے حال سے متعلق ہوتا ہے۔

انہوں نے دو مضمون قومی ادب کے حوالے سے لکھے ہیں۔ ان میں سے ایک مضمون ''نئے ادب کی قدریں'' میں چھ ستمبر ۶۵ء کے بعد کے ادب کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے بہت سے نعروں اور خوابوں کو جن کے بارے میں بعض لوگوں کا خیال تھا کہ یہ واہمہ ہیں۔ وژن قرار دیا کیونکہ اس سے لوگوں میں جرأت اور حوصلہ پیدا ہوا۔ مثلاً بعض لوگوں نے فرشتوں اور اولیاء کو مسلمانوں کی امداد کرتے ہوئے دیکھا وغیرہ۔ البتہ انہوں نے جنگ کی شاعری میں استعمال ہونے والی بعض ایسی علامتوں پر اعتراض کیا ہے جس میں عورت کی تحقیر نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر اجمل روحانی نقطہ نظر سے عورت کی علامت کو نہایت اہم سمجھتے ہیں۔ اسی طرح دوسرا مضمون ادب اور موت کے عنوان سے ہے جو سقوط ڈھاکہ کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ موت جمود اور عدم انقلاب کی علامت ہے مگر ڈاکٹر اجمل کے خیال میں اس کا ایجابی پہلو بھی ہے۔ ''تخلیقی موت نوزائیدگی کے امکان کی علامت ہے۔'' ان کے خیال میں ''اپنی نظروں سے اپنی

ذات کو پہچاننے کا تقاضا موت کا تقاضا ہے اور جب تک یہ تقاضا پورا نہ ہو جائے زندگی اپنی تخلیقی اور کبریائی قوتوں سے آشنا نہیں ہوتی۔ ہمارے ادب میں موت کا تصور اس موت کے تصور سے بہت مختلف ہے جو یورپ اور امریکہ میں سرمایہ داری کے عروج سے پیدا ہوا ہے۔ مغربی ادب میں تکرارِ عمل جبر سے تنگ آ کر موت کی آرزو بڑھ جاتی ہے ہمارے ہاں ادب میں موت کا تصور نوآبادیاتی استحصال کی روایت برقرار رکھنے سے قائم رہا۔ اس نظام کو بدلنے کے لیے زندگی کی ضرورت ہے۔'' اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ معاصر اردو ادب میں شکست اور موت کا تصور نوآبادیاتی استحصال کی وجہ سے ہے اگر چہ اس تصور میں اس نظام کو بدلنے کا احساس بھی پایا جاتا ہے جو زندگی بخش ہے۔

ڈاکٹر اجمل نے فن پاروں کے حوالے سے نفسیاتی تجزیئے بھی کئے ہیں۔ انہوں نے ہیر رانجھا کی داستان کے حوالے سے ہماری اجتماعی نفسیات کا تجزیہ لکھا ہے۔ غالب کے ذوق سفر کا تجزیہ کیا ہے۔ غالب کی شاعری میں سفر کی خواہش کے ساتھ قفس اور زندان کی علامتیں موجود ہیں۔ غالب نے اپنے خطوط میں اپنی شادی اور اپنے شہر دلی کو بھی زندان قرار دیا ہے۔ خطوط میں بھی سفر کی شدید خواہش موجود ہے۔ ڈاکٹر اجمل نے غالب کے ذوق سفر کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''مادر عظمیٰ سے فرار خانہ بدوشی کی وہ کیفیت پیدا کرتا ہے جس میں انسان کسی جگہ بھی چین سے نہیں بیٹھ سکتا۔ وطن سے دور جاتا ہے تو وطن کی یاد ستاتی ہے۔ غالب کے یہاں یہ بے قراری بھی ہے اور سفر کے دوران وطن کی یاد بھی۔ اس لیے وہ خط بھی لکھتے ہیں اور ہجر میں وصال کا مزہ لیتے ہیں۔ ماں سے اس طرح فرار کی علامت جنسی ہیجانات کا غلبہ بھی ہے لیکن توقعات اتنی نازک اور اتنی ناقابل تکمیل ہوتی ہیں کہ ہر قدم پر احساسات کے مجروح ہونے کا خدشہ رہتا ہے۔ غالب کا ذوق سفر مادر سفلی (قفس۔ زندان) سے فرار کی آرزو پر استوار ہے۔ وہ سفر کرتا ہے لیکن اس کی علامتی حیثیت سے انکار کر کے روحانی سطح پر وہ مادر سفلی سے مرد پیر دانا کی طرف سفر کرنا چاہتا ہے۔ علامتی سطح پر سفر کرنے کے لیے جس قسم کی داخلیت ضروری ہے غالب اس سے بہت حد تک نابلد تھے۔ ان کے اندر ایک اضطراب ایک مستقل بے قراری تھی جو انکو انہیں نکال

ہوگئی اور سفر پر آمادہ کرتی لیکن وہ کہیں بھی خوش اور مطمئن نہیں رہے۔ قرائن سے تو یہی پتہ چلتا ہے کہ ان کا ذوق سفر بنیادی طور پر علامتی تھا لیکن انہوں نے ہمیشہ اسے اس بلند سطح سے نیچے کھینچا اور محض روحانی سفر کا درجہ دے دیا۔ میرے خیال میں نہ یہ آبائی خون کی گرمی تھی اور نہ خانہ بدوشی کی روایت کا اثر بلکہ مادر سلبی کے کرخت اور تند بازوؤں میں جکڑے ہوئے انسان کی گھٹن تھی جو غالب کو فرار کی راہیں سجھاتی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ وہ مردپیروانا کو اپنا لیں۔ لیکن یہ کہیں ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ اسے کہیں بھی اپنا سکے ہیں۔''

ڈاکٹر اجمل نے غالب کے ذوق سفر کی خوب نفسیاتی تعبیر پیش کی ہے۔ اس سے اختلاف کی گنجائش تو ہے لیکن اپنے طور پر یہ ایک اہم اور لائق ذکر نقطہ نظر ہے۔ میں نے یہ طویل اقتباس اس لیے نقل کیا ہے کہ ہمارے بعض معاصر شعراء کے یہاں سفر اور ہجرت کی علامتیں کثرت سے پائی جاتی ہیں جبکہ ان شعراء کی زندگی میں سفر اور ہجرت کا کوئی اہم سراغ نہیں ملتا۔ ان علامتوں کو متذکرہ اقتباس کے پس منظر میں دیکھنے سے معانی کے نئے در وا ہوں گے۔

''اقبال ایک ماہر نفسیات کی نظر میں''، میں ڈاکٹر اجمل نے اقبال کا نفسیاتی تجزیہ پیش کیا ہے۔ اقبال کی شاعری میں جیتی جاگتی عورت نظر نہیں آتی۔ وہ عورت کو ایک حقیر ہستی سمجھتا ہے جو خودی کی ابتدائی مراحل میں مرد کی معاون نظر آتی ہے اور بس، ڈاکٹر اجمل نے لکھا ہے کہ ''اقبال کے یہاں محبت کا ذکر تو بہت ہے لیکن اس کی محبت آفاقی قسم کی ہے۔ یہ گوشت پوست کے انسانوں کی محبت نہیں۔ اقبال کی شاعری میں عورت نہیں ہے۔ اقبال کی شاعری میں یہ ایک ایسا خلا ہے جسے کوئی اور الوہیاتی یا ارض ہستی پر نہیں کر سکتی۔ یہ فقط عورت ہی پُر کر سکتی تھی۔ اقبال کی نظر میں عورت ایک حقیر ہستی ہے۔ لیکن عورت کے لیے جذبہ حقارت کا منطقی نتیجہ کیا ہے۔ یہی کہ خودی کے اندر جو ابلیس مضمر ہے اقبال کو اس کا پوری طرح شعور نہیں اس کا ابلیس انسان کی غیر ترقی یافتہ صلاحیتوں کا پیکر نہیں۔ بلکہ بذات خود ایک اچھا خاصا مرد مومن ہے۔ یہ ایک نہایت پارسا قسم کا ابلیس ہے۔ اقبال کا ابلیس بھی جنسی آلائشوں سے منزہ معلوم ہوتا ہے۔ اقبال کے ہاں عورت مرد کی شیطنت کے روپ میں کبھی نظر نہیں آتی۔ وہ بھرے بھرے جذبات

سے لبریز عورت سے گھبراتا ہے عورت کی نسائیت اور ابلیس کی شیطنت سے گریز کا ایک ہی نتیجہ ہے کہ اقبال کسی اور مرد مومن سے زندگی کے اسباق سیکھے۔ یہ مرد مومن پیر رومی ہے جو اقبال کی شاعری کے آخری حصے میں چھایا ہوا ہے یوں معلوم ہوتا ہے کہ آخر میں اس بے زن ابلیس خودی کی نارسائی سے تنگ آکر اقبال کسی مرد مومن (رومی) کی خودی کو شمع ہدایت بناتا ہے۔ اقبال رومی کو اپنا آقا بنا لیتا ہے اور اس کے ہر لفظ پر اور ہر قول پر ایمان بالغیب لے آتا ہے۔"

اقبال کے یہاں جو عورت کی کمی نظر آتی ہے اس خلا کو انہوں نے ایک ایسے مرد مومن کے تصور سے پُر کیا جسے اقبال نے اپنا رہنما بنا لیا اور اپنا آپ اس کے سپرد کر دیا۔ اقبال کو یہ رہنما رومی کی شکل میں ملا جسے اقبال اپنا رہبر کامل تسلیم کرتے ہیں۔

خالدہ حسین کے افسانوں کے بارے میں لکھتے ہوئے ڈاکٹر اجمل نے خالدہ حسین کو داخلی خارجیت کا افسانہ نگار قرار دیا ہے۔ داخلی خارجیت کی اصطلاح نے ایک نیا مفہوم، ایک نیا انداز نظر دیا ہے۔ ان کی رائے میں "یہ افسانے جذبہ حیرت کی تخلیق ہیں۔ خالدہ حسین اپنے داخلی مرد کو قبول نہیں کرتیں۔ اگر وہ اسے قبول کر لیں اور اسے اپنی شخصیت کا جزو بنا لیں تو شاید انہیں اپنی ذات کی تلاش میں عارف کا ہاتھ تھامنے کی ضرورت نہ پڑے۔" یہ ایک ماہر نفسیات کی رائے ہے۔ کسی مضمون میں انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ ہمارے ناول فطری ادراک سے گریزاں ہیں۔ یہ فقرہ اپنی جگہ قابل غور ہے۔

ایک صاحب مطالعہ عالم کی طرح ڈاکٹر اجمل اپنی آراء پر نظر ثانی کرتے رہتے تھے۔ بلکہ اصطلاحات کے ترجمہ پر بھی نظر ثانی کرتے رہتے تھے۔ مثلاً یونگ کی اصطلاح آرا کی ٹائپ کا ترجمہ انہوں نے نخستمثال کیا۔ یعنی اولین مثال۔ اپنی بعد کی تحریروں میں انہوں نے آرکی ٹائپ کے لیے اعیان کا لفظ استعمال کیا جو ابن عربی کی اصطلاح ہے۔ وہ اپنے مطالعے کی روشنی میں نفسیاتی آراء بھی تبدیل کرتے رہتے تھے۔ متذکرہ میں سے کئی آراء سے بعد میں انہوں نے اختلاف بھی کیا۔ مگر ان کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔ خاص طور پر اردو تنقید میں ان کی نفسیاتی تعبیرات کو ہمیشہ اہم سمجھا جائے گا۔

ڈاکٹر محمد اجمل

مسلم روایت کا ایک عظیم نفسیات داں

پروفیسر ڈاکٹر اظہر علی رضوی

نفسیات کا موضوع بحث انسان ہے۔ کہا گیا ہے جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا اپنے ربّ کو پہچان لیا۔ لیکن یہ اپنے آپ کو پہچاننا یا ذات کا تشخص ایک مشکل، پیچیدہ اور ارتقائی عمل ہے۔ ایک فرد دوسرے فرد سے مل کر بنتا ہے۔ فرد کیا ہے۔ ذات کا تشخص کیسے بنتا ہے؟ اس سب کا تعلق معاشرے میں موجود فکری تحریک سے ہے۔ جس فکری تحریک کا تعلق اس قوم اور زمین سے نہیں ہو گا وہاں معاملات میں خرابی پیدا ہو گی۔ پاکستان مین مختلف ماہرین نے مختلف ادوار میں ذات کی بات تو کی، لیکن ہر جگہ تشخص کی کمی کا احساس ہوتا ہے اور ایک بھرپور شخصیت جہاں فکر کا یہ عمل ارتقائی مدارج سے گزرتا ہوا ٹھوس بنیادوں پر قائم ہوتا نظر نہیں آتا۔ ڈاکٹر اجمل صاحبِ دل تھے، مفکر تھے اور عملی دنیا میں ایک کامیاب انسان۔ انہوں نے مسلمانوں کی فکری تحریک کا جائزہ لیا، ملکی حالات، واقعات اور افراد کی صلاحیتوں، رجحانات کو دیکھا، سمجھا، محسوس کیا اور پھر یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ خرابی اگر ہے تو کس نوعیت کی ہے اور کہاں ہے۔ اس تحقیقی سفر میں انہیں احساس ہوا کہ آج کا انسان بھرپور زندگی کے احساس سے محروم ہے بے معنی یک طرفہ زندگی گزار رہا ہے۔ تیسری دنیا اور خاص طور پر پاکستان میں افراد اپنے وجود کے بحران کا شکار ہیں۔ ماضی کی شان دار روایات سے کسی حد تک کٹ چکے ہیں۔ مغربی مفکرین کی سوچ کی یلغار نے ان کے اندر ایک کشمکش، بے چینی، بے اعتمادی پیدا کر دی ہے۔ وہ مذہب کے آفاقی

صولوں اور معیشت و مادی ترقی کے جدید نظریات میں ہم آہنگی پیدا نہیں کر پاتے نتیجہ کے طور پر افراط و تفریط کا شکار ہیں۔ ڈاکٹر اجمل نے ملت کے حوالے سے پھر قوم کی حیثیت سے ان تمام عوامل کا جائزہ لیا جو ترقی کی راہ میں رکاوٹ کا سبب بن رہے ہیں۔ اور دیکھا کہ مغرب سے درآمد شدہ نفسیات کا ہماری سوچ اور فکر سے تال میل نہیں ہے۔ انہوں نے مسلمان اور پھر پاکستانی کی حیثیت سے فرد اور قوم کے سماجی، معاشی، نفسیاتی و روحانی حالات کا جائزہ لیا اور پھر مسلم قوم کی نفسیات کی بات کی، اس طرح نفسیات کی دنیا میں ایسا عظیم ذہنی، فکری انقلاب برپا کیا جس کی مثال نہیں ملتی، وہ دنیاوی لحاظ سے لیکچرار سے چل کر گورنمنٹ کالج کے شعبہ نفسیات کے سربراہ بنے۔ کالج کے پرنسپل رہے۔ پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر، وفاقی سیکرٹری تعلیم بنے، ممبر فیڈرل پبلک سروس کمیشن رہے۔ لیکن ہر جگہ علم کے طلبگار درویش رہے، خارجی اور داخلی حالات میں ربط و ہم آہنگی رہی۔ روایات کا پاس رکھا، دنیا میں اس طرح رہے کہ جیسے ہزاروں سال جینا ہے اور آخرت کو یوں یاد کیا جیسے کل چلے جانا ہے۔ نفسیات کے قومی ادارے کی بنیاد رکھی۔ پاکستان سائیکالوجیکل ایسوسی ایشن کے صدر رہے۔ شعبہ نفسیات میں مسلمان مفکرین کی نفسیات میں خدمات کا پرچہ متعارف کروایا۔ مسلمان مفکرین اور صوفیاء کرام پر تحقیقی مقالے تحریر کئے اور Muslim Contribution to Psychotherapy پر ایک کتاب لکھی، اس طرح مسلم روایات کے ایک عظیم نفسیات داں قرار پائے۔ یہ سب کچھ کیسے ہوا۔ قطرہ پہ گوہر ہونے تک کیا گزری۔ یہ ایک تاریخ ہے۔ ڈاکٹر اجمل کے ذہنی سفر کی الکندی کہتا ہے یہ انسان کا فطری عمل ہے کہ ہر نئی چیز اسے بھاتی ہے انسان ہر چیز کے بارے میں چار بنیادی باتیں جاننا چاہتا ہے جن کا اظہار چار سوالوں کی شکل میں ہوتا ہے۔ کیا کیوں کیسے اور کس لیے۔ انسان انہی سوالات کو "مطالب علمیہ" کا نام دے کر انہیں سائنس و فلسفہ کی بنیاد قرار دیتا ہے۔ کندی کے نزدیک انسان کو ان مطالب علمیہ کی تحصیل ہی فلسفہ کی طرف لے جاتی ہے فلسفہ علموں کا علم ہے اور حکمتوں کی حکمت نفسیات فلسفہ کا حصہ تھی روح کا علم کہلاتی تھی۔ ذہن و شعور سے گزرتی ہوئی کرداریت تک پہنچی بقول ایک مغربی مفکر کے نفسیات نے پہلے روح کا سودا کیا پھر ذہن کا خیر باد کہا اور اب ایسا

لگتا ہے کہ تمام تر شعور سے محروم ہو کر لاشعور اور کردار کی طرف جا رہی ہے۔ لیکن جب
تک انسان زیادہ بے شعور رہے گا اور اپنا شعور کو اجاگر کرنے کی بات کرتے رہیں گے۔
ذات کے شعور کی کمی بہت سی خرابیوں کا سبب بنتی ہے۔ جب ہم موجودہ دور میں عالم
اسلام اور خصوصی طور پر پاکستان کے مسلمانوں کے حالات اور سوچ کا مشاہدہ کرتے ہیں
تو ایک بات بڑی واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ مسلمان وہ نہیں ہیں جو تھے۔ ایسا لگتا
ہے کہ استقرائی عقل سے روشناس کروانے والے مسلمان اپنے مرکز سے دور چلے گئے
ہیں۔ مذہب کی حقیقی روح غائب ہو گئی ہے۔ اگرچہ مذہب کو معقول بنیادوں پر استوار
کرنے کا کام خود رسول اللہ نے ہی شروع فرما دیا تھا آپ کی مستقل دعا یہ تھی:

''اے میرے اللہ! مجھے اشیاء کی اصل حقیقت سے آگاہ کر!

لیکن بقول اقبال کے انسان جس نے کائنات کی ہر شے کے متعلق سوچنے سمجھنے کی
عادت ڈالی ہے مذہب کے متعلق وہ داخلی کیفیت نہیں پیدا کر سکا جس پر دین کا اصل
دارومدار ہے۔ مذہب قوم میں متوازن بصیرت پیدا کرتا ہے۔ لیکن مغربی تعلیم و تربیت اور
غلامی کے اثرات کی وجہ سے مذہب کا اثر یا تو کم ہوتا جا رہا ہے یا پھر بدلی ہوئی شکل میں
سامنے آ رہا ہے اس بات کا احساس اقبال کو، شون اور ڈاکٹر اجمل کو پوری طرح تھا۔
اقبال کے مطابق ہمارا آج کا مسئلہ تو یہی ہے کہ انسان نے افقی جہت میں بہت ترقی
کر لی ہے لیکن عمودی جہت کو بالکل نظرانداز کر رہا ہے۔ شون نے کہا ہے کہ جدید دماغ
کا المیہ یہ ہے کہ انسانوں کی اکثریت روایات کے رمزی اظہار اور سائنس کے مادی
مشاہدات کو باہمی ہم آہنگی کا ادراک کرنے سے قاصر ہے۔ ڈاکٹر اجمل کہتے ہیں کہ آج
کا انسان پوری طرح زندگی کا ادراک کرنے سے عاری ہے۔ تحلیلی نفسیات کے پہلے
باب میں فرائیڈ کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''بیسویں صدی کے جدید
انسان کی جدیدیت کی تشکیل میں سگمنڈ فرائیڈ کا بڑا نمایاں حصہ ہے۔ جدید انسان وہ ہے
جو دنیا میں غیر محفوظ اور اپنے آپ سے بیگانہ ہے جو تشویش کا شکار اور ان گنت اجتماعی
روایات کا اسیر ہے جو طاقتور ہے مگر اپنی طاقت سے خوف زدہ ہے جو کامیاب ہے لیکن اپنی

مسلم قوم کی صورت حال زیادہ ہی خراب ہے۔ مادی ترقی سے محروم اور روحانی قوت بھی غائب، عقل کو بھی دی ہی تھی عشق کو بھی خیرباد کہہ دیا۔ بقول اقبال

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے

مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

اقبال کو اس راکھ کے ڈھیر میں چنگاری نظر آتی تھی، ڈاکٹر اجمل بھی انسان سے مایوس نہیں۔ کہتے ہیں کہ جدید انسان وہ ہستی ہے جو نہ صرف ان کیفیتوں کی آگاہی چاہتا ہے بلکہ ان اسباب کو بھی سمجھنا چاہتا ہے۔ ڈاکٹر اجمل جن کے ہاں علم تھا، وسعت تھی، تجسس تھا، جرأت تھی مسلمان قوم کی حالت زار کے اسباب معلوم کرنے کے لیے اس بحر بیکراں میں کود پڑے، بہت سے پرانے فکری سرمائے کو کھنگال ڈالا۔ انہیں احساس ہوا کہ ہمارے یہاں ضرورت ہے قومی تشخص کی شناخت کی کیونکہ ہمیں نوآبادیاتی کم قدری ذات کا احساس ہے۔ اگر کبھی ہم تحت اللسان الفاظ کو سنیں جسے صوفیاء کرام نے حدیث النفس کہا ہے تو ہم پر یہ راز کھلے گا کہ ہم اکثر و بیشتر اپنے آپ کو کم قدر سمجھتے ہیں اور اپنے آپ سے ایسی باتیں کرتے ہیں جن میں تحقیر ذات کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ وہ ایک مضمون میں بڑی واضح طور پر اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ:

"ہمارے یہاں ایک عادت معمول بن چکی ہے کہ ہم جب کبھی اپنی شناخت کا ذکر کرتے ہیں یا اپنی ثقافت پر بات کرتے ہیں تو ہمیشہ جواز ڈھونڈتے ہیں پاکستان کا یا اسلامی تہذیب کا جواز! جواز ڈھونڈنے کی اس عادت سے خود اعتمادی کی کمی ظاہر ہوتی ہے۔ ہم موجود بھی ہیں ہمارا وجود ہے سالم ثابت اور مستند وجود۔ اب یہ دیکھیں کہ اس وجود سے کیا نکلتا ہے۔

ہماری سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ ہم اس وجود سے آگہی حاصل کریں۔ کلچر کا مطلب خواہ کچھ ہو پہلا اہم سوال یہ ہے کہ میرا آپ سے کیا تعلق ہے۔ میں کون ہوں؟ مثلاً ہمارے صوفیاء کہتے ہیں کہ آدمی صبح اٹھ کر سب سے پہلے خود سے یہ سوال کرے کہ میں کون ہوں؟ کہاں سے آیا ہوں؟ کدھر جا رہا ہوں، پہلے خود اپنے آپ تعلق دوسرے انسانوں سے تعلق پھر تعلق غیر انسانی فطرت سے سکوت لالہ گل

سے کلام پیدا کر اور پھر موت سے تعلق۔ قرآن مجید کا اساسی مقصد انسان میں، اللہ اور کائنات سے روابط کا اعلیٰ شعور پیدا کرنا ہے۔ ایک جان دار شخص کے لیے ضروری ہے کہ وہ کہے کہ میں ایک انسان ہوں، زندہ ہوں، مجھ میں ہر وقت بدلنے کی، اپنی شخصیت کو نئے تجربوں سے آشنا کرنے کی اور ان تجربوں کو نئے سانچے میں ڈھالنے کی صلاحیت موجود ہے۔

ڈاکٹر اجمل نے جب اس وجود کی تلاش میں اپنا ذہنی سفر شروع کیا تو انہیں معلوم ہوا کہ دراصل تشخص ذات میں خرابی کی ایک بڑی وجہ مغربی خردمندانہ روایت ہے۔ آج کا نوجوان جس کی پرورش مغرب کی روایتی تعلیمی اندار میں ہوئی ہے اور جو مغرب کے ایک دیوتا کے بعد دوسرے دیوتا سے وفاداری استوار کرتا رہا ہو اس کے لیے اپنی روایت میں مضبوطی کے ساتھ پاؤں جمائے رکھنا بہت دشوار ہے۔ یہ ہی وجہ ہے کہ انہوں نے نوجوانوں کو جو مغربی فکر سے سرشار ہیں یہ دعوت دی کہ وہ فکر اور محسوسات کے اس خزانے سے ضرور آشنائی حاصل کریں جو ان کے آباؤ اجداد ان کے لیے چھوڑ گئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

ہماری ثقافت اپنی الگ قوت محرکہ رکھتی ہے جو نہ صرف دوسری ثقافتوں سے مستعار ہے اور نہ ہی بیرونی اثرات سے پیدا ہوئے مسلسل ردعمل کا نتیجہ ہے بلکہ یہ تو ایک ٹھوس حرکی روایت ہے جو ہمیں اپنے آباؤ اجداد سے ملی ہے اور جسے ہم آج کل بھول بیٹھے ہیں۔ ڈاکٹر اجمل اس روایت کے امین تھے، وارث تھے۔ دسمبر ۱۹۱۹ء کو لدھیانہ میں پیدا ہوئے۔ والد محترم مخدوم محمد افضل، سیشن جج قادریہ سلسلہ سے اور والدہ مسعودہ بیگم کا تعلق چشتیہ سلسلے سے تھا۔ ددیال اور ننیال دونوں مذہبی گھرانے تھے۔ بچپن ہی میں والدین میں ناچاقی ہوگئی۔ والدہ آپ کو لے کر لاہور آگئیں اور کوچہ چابک سواراں میں رہائش پذیر ہوئیں وکٹوریہ گرلز ہائی اسکول میں درس و تدریس کا کام شروع کیا۔ اس ذہین اور تجسس رکھنے والے بچے کی پرورش علمی ماحول میں ماں کی شفقت کے زیر سایہ ہوئی۔ کہا جاتا ہے گھر ہی وہ جگہ ہے جہاں ہم گھر چھوڑنے کی قوت حاصل کرتے ہیں۔ ڈاکٹر اجمل ابتداء ہی سے کچھ نہ کچھ کرنے کی خواہش رکھتے تھے۔ شروع ہی سے زندگی

میں مذہبی رنگ غالب تھا۔ چنیہ والی مسجد میں مولانا غزنوی کی تلاوت سے محظوظ ہوتے اور ان کی امامت میں نماز پڑھتے۔ مدرسہ سے گھر اور گھر سے مسجد یہ روز کا معمول تھا۔ مشن ہائی اسکول میں بائبل کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ایک دفعہ ماسٹر صاحب نے ہابیل کو ہاہم کہا تو انہوں نے قرآن کے حوالے سے ہابیل کہا اور ماسٹر صاحب کی مار کھائی۔ کہتے ہیں کہ یہی وہ کشمکش تھی جس نے مذہب کو سمجھنے کی خواہش اور شوق پیدا کیا۔ شروع ہی سے زندگی میں تجسس تھا ہر چیز کے ماخذ کی تلاش کرنے کی عادت بن گئی تھی اس جستجو سے فلسفہ میں دلچسپی پیدا ہوئی اور پھر موضوع گفتگو منطق بن گیا۔ شروع ہی سے تشخص ذات کی تلاش تھی۔ یہ ہی تلاش اجتماعی شکل میں ڈاکٹر اجمل کے ہاں قومی تشخص کی تلاش بن گئی۔ فلسفہ میں ایم اے کیا۔ سقراط پر ایک طویل مضمون لکھا۔ کہتے ہیں کہ جو حق کی حمایت کے لیے ہمت شجاعت درکار ہے وہ سقراط مین بدرجہ اتم موجود تھی۔ سقراط کے پاس علم تھا، ہمت تھی اور جرأت تھی لیکن بغاوت نہ تھی انصاف عزیز تھا۔ کریٹو نے جب جیل میں سقراط سے کہا کہ وہ بھاگ چلے تو سقراط نے انکار کر دیا اور کہا وطن کے قانون کو توڑنا انصاف کو صدمہ پہنچانا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو اس بات کا احساس تھا کہ وہ دنیائے انسانیت کے عظیم معلموں سقراط، افلاطون، حضرت مسیح اور آں حضرت کی وراثت کے امین ہیں۔ انہوں نے مذہبی تجسس کے ساتھ منطق کے سہارے سوچ کر آگے بڑھایا اور سچ کا ساتھ دیا۔ جب اور جہاں یہ احساس ہوا کہ انصاف کمزور پڑ رہا ہے تو راستہ بدل لیا۔ جب ڈاکٹر صاحب کی ابتدائی زندگی کا جائزہ لیتے ہیں تو یہاں جوانی میں درویشی کا عمل نظر آتا ہے۔ آزاد طبیعت انسان تھے۔ کئی نوکریاں چھوڑیں۔ آخر کار اللہ توکل پر پی ایچ ڈی میں داخلہ لے لیا۔ بی بی سی سے لاتعداد فیچر نشر کئے۔ یہاں بھی رزق حلال کی طلب اور درویشی قائم رہی۔ واپس آئے تو فرائیڈ کی جگہ ژنگ سے بہت متاثر تھے اور پھر ژنگ زندگی کا اوڑھنا بچھونا بن گیا۔ اس پر یہ کتاب تحلیلی نفسیات لکھی۔ آغاز میں لکھتے ہیں اگرچہ ژنگ کی نفسیات کی ابتداء ایک لحاظ سے فرائیڈ کی نفسیات میں تلاش کی جاسکتی ہے لیکن فرائیڈ کے مطالعہ سے پہلے ژنگ نے لاشعور کی حرکی قوتوں کا کسی قدر اندازہ کر لیا تھا [illegible] یہ سمجھتا ہے کہ جن صوفیاء کرام اور اولیاء کو

مذہبی تجربہ ہوا وہ ذہنی مریض نہیں تھے ان کے دماغ میں خلل نہیں تھا وہ ایسے لوگ تھے جو غیر معمولی تو تھے لیکن غیر معمولی اس لیے تھے کہ انہوں نے روحانی لحاظ سے اعلیٰ سطح پر زندگی بسر کرنے کا فن سیکھا تھا اور وہ اس فن کے ماہر تھے۔ ژنگ یہ بھی سمجھتا ہے کہ عقیدے اور عقل میں کوئی تضاد نہیں۔ عقیدہ اگر سلامت روی پر استوار ہے تو وہ عقل کے تجس کہ عقیدے اور عقل میں کوئی تضاد نہیں۔ عقیدہ اگر سلامت روی پر استوار ہے تو وہ عقل کے تجس سے لرزاں اور پریشان نہیں ہوتا۔ عقل ہمیں اقدار نہیں بتاتی۔ اقدار ہمیں جذبات بتاتے ہیں۔ عشق ہمیں جذبات کی اقدار سے آگاہ کرتا ہے عقل ہمیں راہیں سمجھاتی ہے جن کے ذریعہ ہم ان اقدار کو حاصل کر سکتے ہیں۔ جو شخص جذبات کی اقدار سے آگاہ نہیں ہونا چاہتا اور عقل کو اپنا راہنما سمجھتا ہے وہ زمانے کی انجابی قدروں کو اپنا کر خود کو بہت عقلمند سمجھتا ہے۔ جو شخص اپنی اطاعت نہیں کرتا اسے غیروں کا مطیع ہو کر رہنا پڑتا ہے۔

ڈاکٹر اجمل ایک مکمل انسان تھے، عقل تھی، عقیدہ تھا، اقدار کی پاسداری تھی، تجس تھا، تجس کی لازمی شرط یہ ہے کہ جو چیز سامنے آئے اسے دیکھا جائے، آنکھیں بند نہ کی جائیں بلکہ نئی راہیں تلاش کی جائیں، مشرقی ٹھوس روایات کے ساتھ سفر کا آغاز کیا۔ مغرب کو دیکھا اور پڑھا، مسلم ثقافت اور روایت نے قوت محرکہ کے طور پر کام کیا۔ لکیر کے فقیر نہیں بنے۔ دل کی گہرائی سے فلسفہ پڑھا، نفسیات کو دیکھا، ادب کو سمجھا، مذہب کو محسوس کیا، اور پھر کہا: ہم خود دنیاوی مسئلہ ہیں۔ پہلے ہم اسے حل کریں تو مسائل بھی حل ہو سکتے ہیں صنعتی ترقی نے انسان کو مختلف خانوں میں بانٹ کر اس کے تشخص کو مجروح کر دیا ہے۔ حسن نصر نے کہا ہے کہ جدید تہذیب نے بہت کچھ جاننے کے لیے انسان کے حصے بخرے کر دیئے ہیں۔ اس کو مختلف خانوں میں بانٹ دیا ہے اور اب ان خانوں کو یکجا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ لیکن گسٹالٹ مکتب فکر والے اس بات کو برملا کہتے ہیں کہ کبھی بھی اجزاء کل کے برابر نہیں ہو سکتے جب تک ہم اپنے آپ سے آگاہ نہیں ہوں گے خود کو اپنا دشمن سمجھتے رہیں گے۔ مسائل بڑھتے رہیں گے لیکن جب ہم اپنے آپ کی اور اپنے روابط کی آگہی حاصل کرنے لگیں گے تو بنیادی مسئلہ حل ہو

جائے گا اور پھر دوسرے مسائل جنہیں ہم نے خود پیدا کیا ہے حل کرنے آسان ہو جائیں گے۔ اس آگہی سے ہمارا تخلیقی سرچشمہ ابلے گا۔ یہ ہی محدود کا لامحدود کی طرف سفر ہے۔
ڈاکٹر اجمل کو اس سفر میں اکبرالہ آبادی کے اس شعر کو صداقت کا احساس تھا کہ:

جہاں ہستی ہوئی محدود لاکھوں پیچ و خم پڑتے ہیں
عقیدے، عقل، عنصر سب کے سب آپس میں لڑتے ہیں

مغربی مفکرین کے ہاں، عقیدے اور عقل میں کشمکش ہے اور اس کے اثرات ہمارے یہاں بھی پائے جاتے ہیں غالب پر لکھے گئے ایک مضمون میں کہتے ہیں مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ غالب کے ہاں اجزائے نفس کا تو احساس شدید ہے، لیکن ان اجزاء کو کسی شیرازہ میں یکجا کرنے کی صلاحیت کا شعور کم ہے۔ پارہ پارہ ہونے، ٹکڑے ٹکڑے ہونے کا شعور تو ہے لیکن ان ٹکڑوں سے کوئی نئی ترکیب (Synthesis) بنانے کی کوشش نہیں ہے۔ نار کی فراوانی ہے لیکن نور بننے کی سکت نہیں ہے۔ ڈاکٹر اجمل کے یہاں ترکیب (Synthesis) بنانے کی خوبی بدرجہ اتم موجود ہے۔ دیکھئے بدی اور نیکی، خیروشر کا مسئلہ کس خوبصورتی سے حل کیا ہے۔ ایک مضمون نفسیات اور مذہب میں بتاتے ہیں مذہبی علوم کی تحصیل کے سلسلے میں میری حیثیت ایک مبتدی کی ہے۔ اس سے نفسیات اور مذہب کے تعلق کے بارے میں جابجا دل میں شک گزرتا ہے۔ تصوف کی اکثر کتابوں مین جو میری نظر سے گزری ہیں شیطان کو بہت بُرا بھلا کہا گیا ہے۔ حضرت غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانی الفتح الربانی میں فرماتے ہیں کہ مومن یوں زندگی بسر کرتا ہے کہ اسے شیطان کی خبر تک نہیں ہوتی۔ نفسیات کے طالب علم ہونے کی حیثیت سے یہ بات مجھ پر کٹھن گزری۔ لیکن جب یہ حدیث نبوی دیکھی تو بات سمجھ میں آ گئی۔ آنحضرت نے حضرت علی سے فرمایا کہ آدم اور شیطان میں جنگ رہی لیکن میں نے اپنے شیطان کو مسلمان کر لیا ہے۔ شیطان کو مسلمان کرنا ارتفاع بھی ہے اور جنسی اور تخریبی آرزوؤں کو ایمان کی حدود میں پابند کرنا بھی ہے۔ انجیل میں آیا ہے کہ جب حضرت عیسیٰ پیدا ہوئے تو شیطان کو تحت الثریٰ میں مقید کر دیا گیا اور یہی بنیاد تھی اس رہبانیت کی جو بعد میں مسیحیت میں نظر آئی۔ شیطان کو مسلمان کرنے سے رہبانیت کی ضرورت نہیں رہتی۔

ہر بچہ تو فطرت ہی پر پیدا ہوتا ہے لیکن وہ خاندان کی وجہ سے ان سماجی و ثقافتی عوامل و اسباب کی بناء پر جن میں وہ پرورش پاتا ہے اِدھر اُدھر ہو جاتا ہے۔ حدیث قدسی ہے میں نے اپنے تمام بندوں کو اس طرح پیدا کیا کہ وہ سب کے سب دین حنیف پر تھے پھر ان کے پاس شیطان آئے اور انہیں دین حق سے روگرداں کر دیا، انسان کو ارادہ کی آزادی دی گئی ہے اپنے ارادہ سے وہ خیر یا شر کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اور ہم نے دونوں راستے بتلا دیئے۔ ہر شخص شیطان کو مسلمان نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اسے زندگی بھر خیر و شر کے معرکہ سے واسطہ رہتا ہے۔ انسان اپنی استعداد کے ذریعہ حلال و حرام، حق و باطل، خیر و شر کا ادراک کر لیتا ہے۔ انسان کا کردار، اس کے خیالات کا رہن منت ہے۔ ہر انسان کی اپنی افتاد طبع ہوتی ہے۔ اپنا مزاج ہوتا ہے۔ حدیث ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پوری زمین سے ایک مٹھی مٹی اُٹھا کر آدم علیہ السلام کو پیدا کیا۔ اسی لیے زمین میں جتنے قسم کی مٹیاں ہیں اتنے ہی قسم کے انسان ہیں۔ اس طرح لوگوں کی فطری اور طبعی خصوصیات مختلف ہوتی ہیں۔ ایک بات تو یہ ثابت ہے کہ مختلف علاقوں کے لوگ مختلف ہوتے ہیں۔ گویا کہ جغرافیائی حالات بھی فرد پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ایک ہی علاقے اور جگہ کے افراد ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ شکل و صورت میں، صلاحیت اہلیت اور سوچ و فکر میں ایک جیسی استعداد نہیں ہوتی۔ دعوت اسلام کی پہلی نمایاں بات تو یہ ہے کہ یہ دعوت تمام دنیا کے انسانوں کے لیے ہے۔ اور ہر دَور کے لیے ہے۔ اس کا اوّل مخاطب ہر انسان کی مکمل ذات ہے جس میں زندگی کا ہر پہلو شامل ہے۔ جن لوگوں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دعوت قبول کی ان کے روحانی افق میں خاصی وسعت پیدا ہوئی لیکن زمانہ گزرنے کے ساتھ اس وسعت میں کمی آتی گئی۔ اور جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے، انسان مختلف خانوں میں بٹ گیا، مذہب کی گرفت کمزور ہوگئی۔ دنیائے اسلام دو قوتوں روایت پسندی اور جدیدیت کے درمیان ایک شدید Dilemma کا شکار ہو کر، افراط و تفریط میں مبتلا ہو گئی ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے اللہ کی وحدانیت ... اجتماعیت وا واسطہ وطنی قومیت سے پڑا ہے۔

نوآبادیاتی نظام نے تیسری دنیا کے باسیوں کے کلچر، تہذیب، تشخص کو پامال کر کے رکھ دیا۔ نتیجہ کے طور پر مختلف ملکوں میں باغیانہ تحریکیں چل رہی ہیں۔ جہاں تشخص کے لیے تشدد کو بھی جائز کہا جا رہا ہے۔

مثال کے طور پر فینن نے الجزائر کی محکومی پر ایک مقالہ میں لکھا ہے کہ نوآبادیاتی ممالک میں غیر ملکی حکمران افراد کو اس بات کا احساس دلاتے ہیں یہ جو تم ایک دوسرے کو قتل کرتے ہو آپس میں لڑتے ہو کام محنت سے نہیں کرتے یہ دراصل اس وجہ سے ہے کہ تمہارا دماغی ڈھانچہ پسماندہ ہے۔ اسی طرح افریقی اپنے دماغ کے سامنے کے گوشوں کو استعمال بہت کم کرتے ہیں یہی بات کسی حد تک ہمارے ملک کے بارے میں امریکہ اور دوسرے ترقی یافتہ ممالک کی طرف سے سننے میں آتی ہے کہ تم بنیاد پرست، مذہبی جنونی، دہشت گرد اور کم عقل ہو۔ ایٹمی صلاحیت کے مالک ہونے کے قابل نہیں ہو۔ ڈاکٹر اجمل نے نفسیاتی طور پر اپنی تحریروں کے ذریعے قوم کو یہ احساس دلایا کہ ہم کسی سے کم نہیں ہیں ہم میں کام کرنے کی پوری صلاحیت ہے ہم امن پسند ہیں مذہبی ہیں اور یہی ہمارا قومی تشخص ہے۔ غیر کی باتوں میں آنے کی بجائے اپنے مذہب، تہذیب، کلچر اور ثقافت کو صرف تحریر یا نصیحت کے طور پر نہ سمجھیں بلکہ اس کا حصہ بن جائیں۔ انسان کی بقا اسی میں ہے کہ ایک دوسرے کے کلچر کو سمجھیں اس کی خوبیوں اور خامیوں سے آگاہ ہوں اسی طرح انسانیت کا مستقبل روشن ہو سکتا ہے۔

ڈاکٹر محمد اجمل

پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ چوہدری سے مکالمہ

انٹرویو نگار: نگہت حیدر، خدیجہ مفتی

سوال : آپ پیچھے مڑ کر دیکھیں تو کب ڈاکٹر اجمل سے پہلی بار تعارف ہوا تھا اور کیا اثر لیا آپ نے اس شناسائی کا؟

جواب : مجھے کچھ ٹھیک سے یاد نہیں کہ پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی تھی مگر میں چونکہ راوین ہوں اور ڈاکٹر اجمل بھی وہیں تھے۔ وہ نفسیات اور فلسفہ کے شعبوں کے چیئرمین تھے میں ان کا براہِ راست طالبِ علم کبھی نہیں رہا مگر پھر بھی میں چپکے سے جا کر ان کے لیکچرز سنا کرتا تھا۔ پھر وہ گورنمنٹ کالج کے پرنسپل بنے۔ تب میں نے انتظامی طور پر ان کے ماتحت اچھا وقت گزارا۔ میں انہیں ایک پرنسپل، کولیگ، وفاقی سیکرٹری اور ایک اچھے انسان کے طور پر جانتا ہوں۔ ہم اکٹھے ٹینس بھی کھیلا کرتے تھے۔ ان کے ایک بھائی جو ان کے سگے بھائی تو نہ تھے مگر والدہ کی طرف سے ان کے بھائی تھے۔ جناب جاوید مخدوم۔ وہ بھی سیاسیات ہی پڑھاتے تھے اور میرے کولیگ تھے۔ ان کے ذریعے ڈاکٹر صاحب کے گھر آنا جانا ہوتا رہتا تھا۔ لہٰذا میری اور ان کی گپ شپ ہوتی۔ میں نے انہیں بے حد مشفق اور اچھا دوست پایا۔ میں کہتا ہوں کہ اس بندے نے مجھے زندگی میں چلنا سکھایا ہے کہ کسی طرح عمل کرنا ہے اور کس طرح لوگوں کو برداشت کرنا ہے۔ انہیں خود بھی غصہ بہت کم آیا کرتا تھا۔ وہ میرے محسن ہیں۔ مجھے سنٹرل اوورسیز سکیم کا سکالرشپ ان کی وجہ سے ملا۔ اگر وہ وفاقی حکومت میں سیکرٹری تعلیم نہ ہوتے تو میں [illegible] حق مجھے مل گیا ہوتا۔ انہوں نے میرے لیے احتجاج کیا اور مستعفی ہو جانے کی

دھمکی دی۔ تب میں نے پہلی مرتبہ انہیں غصے میں دیکھا تھا جبکہ ویسے وہ بہت ہمدرد انسان تھے۔ وہ بہترین اُستاد تھے۔ آپ یقین نہیں کریں گے اس بات پر کہ 12 بجے ان کی فلسفے کی کلاس شروع ہوتی تھی اور ایک گھنٹے کے لیکچر کے بدلے تین گھنٹے گزر جاتے تھے اور لڑکے لڑکیوں کو وقت گزرنے کا پتہ ہی نہیں چلتا تھا۔ وہ بس بیٹھے سنتے رہتے تھے اور ڈاکٹر اجمل بولتے چلے جاتے۔ انہیں اپنے مضمون پر اس قدر عبور حاصل تھا۔ وہ بے حد خوبصورت استاد تھے۔ شخصیت کے لحاظ سے میں نے ان سے زیادہ شریف آدمی نہیں دیکھا۔ وہ بہت ہی شفیق باپ کی طرح کے استاد تھے۔ بہت ہی رحمدل منتظم تھے۔ جس طرح انہوں نے گورنمنٹ کالج کی پرنسپلی کی وہ بے مثال ہے۔ جس طرح وہ بچوں کو سکھاتے تھے جس طرح سٹاف کی میٹنگ سے خطاب کرتے تھے۔ ڈاکٹر اجمل منہ میں سگریٹ دبائے آ کے کھڑے ہوتے اور کہتے ہاں بھئی بات یہ ہے کہ تعلیمی مسائل مین بطور اساتذہ آپ کی رہنمائی میرے لیے انتہائی ضروری ہے میں آپ کے بغیر نہیں چل سکتا۔ آپ نے آگے بڑھنا ہے میں آپ کو ایک سمت دے رہا ہوں اس سمت میں آپ کو چلنا ہے اور لوگ ان کی پیروی کرتے تھے۔

سوال : آپ نے بتایا کہ ڈاکٹر صاحب بے حد شفیق تھے۔ غصہ بالکل نہیں کرتے تھے اور منتظم اعلیٰ بھی تھے تو نظم و نسق کا کیا بنتا تھا؟

جواب : محبت سے۔ دیکھئے گورنمنٹ کالج کا اپنا کلچر ہے۔ وہاں سیاست نہیں تھی۔ اساتذہ اور طلباء کے مابین کوئی تناؤ نہیں تھا۔ ہر کام امن سے ہوتا تھا۔ میں 12 سال پروفیسرز کی ایسوسی ایشن کا صدر رہا ہوں۔ ڈاکٹر اجمل بذاتِ خود کبھی کبھی میرے پاس آتے اور دریافت کرتے کہ کام کیسا چل رہا ہے اور کہتے کہ آپ ٹھیک کام کر رہے ہیں۔ چلیں اگلے سال کے لیے بھی آپ ہی منتخب ہو گئے ہیں۔ وہاں طلبہ پڑھنے کے لیے آتے تھے۔ دیگر سرگرمیاں بھی ہوتی تھیں۔ ہر طالب علم کسی نہ کسی چیز میں انوالو تھا۔ کبھی کوئی سنگین صورت حال سامنے نہ آئی تھی۔ ڈاکٹر اجمل سب طلباء کے لیے ایک والد، ایک بزرگ کی طرح تھے۔ ان کے دیکھتے ہی دیکھتے طلباء کلاسز میں چلے جاتے۔ یہ ان

کے تدبر اور محبت کا کمال تھا۔ وہ پیکر پدرانہ تھے۔ خاص کر میرے لیے تو وہ روحانی باپ تھے۔ انہوں نے لاشعوری طور پر میری تربیت کی۔ انہوں نے میرے اخلاق میں، بولنے کے انداز میں، پڑھانے کے انداز میں، معاف کرنے اور خطا بھول جانے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ بلاشبہ وہ عظیم تھے۔

سوال : ان کی سکالرلی خدمات کے بارے میں کچھ بتائیں۔

جواب : وہ عظیم سکالر تھے۔ مختلف کانفرنسوں میں انہوں نے جو پیپرز پیش کیے کبھی آپ ان کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ وہ گہرے سکالر تھے۔ ذہنی طور پر بہت باریکیوں اور گہرائیوں میں جانے والا انسان تھا۔ یہاں تک کہ گھریلو زندگی میں بھی وہ قناعت پسند اور مطمئن بندے تھے۔ کونسا عہدہ ہے جو انہوں نے ہولڈ نہ کیا ہو۔ وہ وائس چانسلر رہے۔ وفاقی حکومت میں سیکرٹری بھی رہے مگر پھر بھی قانع تھے۔ ان کے علم کی گہرائی کا اندازہ لگانا مشکل کام ہے۔ وہ حقیقتاً تعلیم یافتہ شخص تھے۔ پیدائشی استاد تھے اور نہایت اچھے انسان تھے۔ وہ تو وہ بندہ تھا جسے صرف یاد کر کے ہی بڑی تازگی محسوس ہوتی ہے۔ شہزاد قیصر کا وائے وا لینے ملتان آئے حالانکہ وہ بے حد بیمار تھے۔ خاصے نحیف دکھ رہے تھے مگر پھر بھی آئے۔

سوال : ان کی ذات کی تاثیر کیا تھی؟

جواب : میرا تعلق ان سے دھیرے دھیرے بنا۔ پہلے کولیگ تھے پھر جب وہ مجھے اپنے ساتھ ٹینس کھلانے لگے تو کھیل سے فراغت کے بعد اکٹھے شکنجبین پیتے اور باتیں کرتے۔ اسی طرح باتوں ہی باتوں میں زندگی کے مسائل پر روشنی ڈالتے۔ انہوں نے میرے ذہن کو بے حد متاثر کیا۔ وہ فلسفی تھے۔ زندگی کے بارے میں سوچا کرتے تھے۔ مذہب اور علم کا تجزیہ کیا کرتے تھے۔ ان چیزوں پر بحث کرتے تھے تو سننے والے بس مگن ہو کر رہ جاتے تھے۔ یہ سب چیزیں آپ پر اپنا تاثر چھوڑتی ہیں۔

سوال : ان میں کوئی خراب بات بھی پائی آپ نے یا نہیں؟
جواب : سگریٹ بہت پیتے تھے۔ چین سموکر تھے۔ سگریٹ کی راکھ بھر بھر کر ان کپڑوں پر برستی جاتی تھی۔ بات کرتے تو تب بھی سگریٹ لبوں میں دبا ہوتا اور آواز کے ساتھ ساتھ تھرکتا جاتا۔ ہمیں اتنی جرأت نہیں تھی کہ ان سے کہہ دیتے کہ کیوں پیتے ہیں۔ سگریٹ ان کی ذات کا حصہ تھی۔

سوال : ان کا تنقیدی جائزہ لیں تو کیا کہیں گے؟
جواب : خدا کرے ان جیسے لوگ ہمیں روز ملیں۔ ان جیسے اور پیدا ہونے چاہئیں۔ ان کی سب سے اچھی بات کہ جھوٹ کبھی نہیں بولتے تھے۔ میں نے خود بڑی تلخ باتیں سن رکھی ہیں ان سے۔ جو محسوس کرتے صاف صاف کہہ ڈالتے تھے۔ یہ بڑی خاصیت تھی ان کی۔ وہ آئیڈلز کا آدمی تھا۔ ان کا ایک تصور تھا مکمل انسان کا۔ کبھی وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کرتے کہ وہ مکمل ترین انسان تھے۔ وہ آئیڈلسٹ تھے۔ شاید فلاسفر ہوتا ہی ایسا ہے۔ پاکستان کے بہت شیدائی تھے۔ وہ چاہتے تو پاکستان چھوڑ کر جا سکتے تھے مگر انہوں نے ایسا کبھی نہیں کیا۔ کوئی بات ناگوار گزرتی تو پھر اٹھا کر اظہار کرتے تھے جیسے میری فائل اٹھائی اور سیدھے وزیر کے پاس پہنچ گئے اور کہا کہ آپ نے یہ غلط کیا ہے اور اسے ٹھیک کروا کر ہی دم لیا۔

سوال : اگر ایک بار ان سے ملنے کا موقع مل جائے تو کیا کہیں گے آپ ان سے؟
جواب : ان سے کہوں گا کہ تھوڑی دیر رک جائیں۔ انہیں مزید جینا چاہیے تھا۔ وہ عظیم آدمی تھے۔ اللہ ہمیں توفیق دے ان جیسا انسان بننے کی۔ ان جتنا حساس اور عالم بننے کی۔ اللہ ہمیں طاقت دے ان کے نقش قدم پر چلنے کی۔ ہم نے ان جیسا کیا بننا ہے وہ تو بندہ بھی بہت عظیم تھا۔

سگمنڈ فرائیڈ

بیسویں صدی کے جدید انسان کی جدیدیت کی تشکیل میں سگمنڈ فرائیڈ کا بڑا نمایاں حصہ ہے۔ جدید انسان وہ ہے جو دُنیا میں غیر محفوظ اور اپنے آپ سے نامانوس ہے، جو تشویش کا شکار اور اَن گنت اجتماعی روابط میں اسیر ہے، جو طاقت ور ہے مگر اپنی طاقت سے خوف زدہ، جو کامیاب ہے لیکن اپنی کامیابی سے غیر مطمئن۔ اِس کے ساتھ ساتھ جدید انسان وہ ہستی ہے جو نہ صرف ان کیفیتوں کی آگہی چاہتا ہے، بلکہ اُن کے اسباب کو بھی سمجھنا چاہتا ہے۔ ان اسباب کو وہ (فرائیڈ کے زیر اثر) جذبات میں تلاش کرتا ہے، اور اِس تلاش میں وہ جذباتی ہو گیا ہے۔ اس کے فکر اور ادب میں جذبہ کا انتشار ہے، وحدتِ فکر اور تدبّر کا تسلسل موجود نہیں ہے۔ یہ وہ انسان ہے جو خواب کو حقیقت کی بگڑی ہوئی صورت نہیں سمجھتا، بلکہ حقیقت کو خواب کی بگڑی ہوئی شکل تصور کرتا ہے۔

سگمنڈ فرائیڈ کون تھا؟ اور اس نے کیا کچھ کیا اور کیا کیا کہا؟ فرائیڈ کے ایک وفادار شاگرد، ارنسٹ جونز نے ان سوالوں کے جواب اپنی ایک کتاب 'فرائیڈ کی زندگی اور افکار' میں دیئے ہیں۔ اس مضمون میں ہم ان جوابوں پر تبصرہ کرنے کی کوشش کریں گے۔

پہلا سوال جو ہمارے ذہن میں پیدا ہوتا ہے یہ ہے کہ اس بلند شخصیت کے افکار کی تہ میں 'نمونہ' کون سا تھا؟ جب وہ سوچتا تھا تو اس کے سامنے کونسا خاکہ ہوتا تھا جس میں وہ رنگ بھرتا تھا؟ اس کے تفکر و تدبّر کی نہج کیا تھا؟ اگر ہم تجزیۂ نفسی کے عمل کو غور سے دیکھیں تو ہم پر یہ واضح ہوگا کہ فرائیڈ کے ذہن میں 'پوشیدہ شہزادہ' کا تصور تھا، جس سے اس نے اپنے اکثر خیالات کا نمونہ لیا تھا۔ جب مریض یہ کہتا کہ مجھے 'طبقات الارض' کے علم سے دلچسپی ہے، تو فرائیڈ اسے بتلاتا کہ دراصل وہ ماں کے بطن کا جائزہ لینا چاہتا ہے۔ جب مریض کہتا کہ میں سرخ چیزوں کو پسند کرتا ہوں تو فرائیڈ اس کی یہ تعبیر کرتا کہ مریض کے دل میں غیض و غضب کے جذبات موج زن ہیں، جنہیں وہ شعوری طور پر قبول کرنا نہیں چاہتا۔ گویا مریض جو بات بھی کرتا ہے وہ اپنی سطح پر ایک سطحی صداقت کی حامل ہے، اس کی صحیح صداقت ذہن کی پوشیدہ تہوں میں مضمر ہے، یعنی سطحی بیان کے معنی وہ نہیں ہیں جو بظاہر دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے 'معنی' یا 'معانی' لاشعور میں پوشیدہ چند خواہشات ہیں جو بیان کرنے والے کے شعور سے پنہاں ہیں۔ اس کے معنی کہ مجھے طبقات الارض سے دلچسپی ہے ایک خارجی شاہد کے لیے اور ہیں، لیکن میرے لیے اس کے معانی دو سطحوں پر متعین کیے جا سکتے ہیں، ایک شعوری سطح اور دوسرے لاشعوری سطح پر جو معنی تشکیل پاتے ہیں وہ زیادہ حقیقی ہیں، کیونکہ وہ شعوری معنی کا سبب ہیں۔ اس طرز فکر کا ایک خوش آئند پہلو یہ تھا (اور غالباً نفسیات کی تاریخ میں اس کا اظہار پہلی مرتبہ ہوا) کہ ہر فکر یا نظامِ افکار کو سمجھنے کے لیے ہمیں اس شخصیت کا مطالعہ بھی کرنا چاہیے جس نے یہ نظامِ افکار پیش کیا۔ جس طرح ہم ذہنی مرض کی علامتوں کے اسباب مریض کی شخصیت میں تلاش کرتے ہیں، اُسی طرح ہمیں ہر فکر اور نظامِ افکار کے مطالب مفکر کی شخصیت میں تلاش کرنے چاہئیں۔ انسان کا ہر فعل ہر فکر اس کی نفسی حقیقت کا اظہار ہے۔ جہاں اس کے مربوط اور معقول افکار اس کی شخصیت کے آئینہ دار ہیں وہاں اس کی لفظی اور عملی بدحواسیاں، اس کے خواب اور اس کے دن سپنے بھی اس کی شخصیت کی ترجمانی کرتے ہیں۔ فرائیڈ کے نزدیک یہ بات بھی ایک حقیقت ہے کہ کسی شخص کے افکار کا اس کی بدحواسیوں اور اس کے خوابوں سے لازمی تعلق ہے۔ شخصیت

کے مطالعہ میں ہمارے لیے کسی شخص کے معقول اور غیر معقول، دونوں پہلوؤں کا جائزہ لینا اور ان دونوں پہلوؤں کا باہمی ربط دیکھنا ضروری ہے۔ تاریخِ نفسیات میں غالباً پہلی مرتبہ نفسی حقیقت کو اس قدر اہمیت دی گئی۔

کسی شخص کی نفسی حقیقت کو معلوم کرنے کے لیے فرائیڈ نے ایک نیا طریقہ ایجاد کیا، جسے وہ 'آزاد تلازم' کا نام دیتا ہے۔ آزاد تلازم کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں، ایک تو یہ کہ انسان کی زبان پر جو لفظ بھی آئے وہ اُسے بولتا چلا جائے۔ لیکن یہ مفہوم صحیح نہیں ہے کیونکہ فرائیڈ اپنے مریضوں سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ ایک بالغ انسان کی چند ذمہ داریاں قبول کریں۔ ایک ذمہ داری تو یہ کہ مریض علاج کی اُجرت باقاعدہ ادا کرے۔ اِس لیے کہ اُجرت کی ادائیگی ایک طرح کی قربانی ہے اور جب تک وہ قربانی نہیں کرے گا، صحت یاب نہیں ہو سکے گا۔ بعض لوگ اس عمل کو محض فرائیڈ کی حرص سے منسوب کرتے ہیں۔ لیکن یہ پابندی مریض کے لیے ضروری ہے، کیونکہ اِس سے اُسے احساس رہتا ہے کہ وہ کسی قیمتی چیز سے محروم ہو کر ہی صحت پا سکتا ہے۔ اس طرح وہ علاج میں بھی پورا تعاون کرتا ہے۔ فرائیڈ اسے 'قانونِ محرومی' کہتا ہے۔ اس کے علاوہ دوسری ذمہ داری جو فرائیڈ اپنے مریض پر عائد کرتا ہے یہ ہے کہ وہ اپنے الفاظ کو خیالات کا مرتبہ دے کر بیان کرے۔ لہٰذا آزاد تلازم کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ مریض شعوری اور ارادی طور پر اپنے خیالات، احساسات اور جذبات کو بیان کرتا چلا جائے، چاہے ان خیالات، احساسات اور جذبات میں سے بعض اس کے اخلاقی، جمالیاتی اور مذہبی شعور کو صدمہ پہنچاتے ہوں۔ مریض صحت یاب اس صورت میں ہوگا کہ اس کے ذہن میں جو کچھ ہے اسے بعینہٖ بیان کر دے۔

یہ دو ضابطے ایسے ہیں جو مریض کو علاج کے پہلے دن سے ہی اپنے آپ پر عائد کرنے پڑتے ہیں۔ ان ضابطوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ فرائیڈ نے اپنے اخلاقی ذمہ داری کے تصورات کسی حد تک تجزیۂ نفسی کے عمل پر بھی عائد کر دیئے تھے۔ اِس طرح اُس زمانہ میں یہودیوں کی تربیت میں پارسائی، ریاضت اور قربانی کے جو خیالات تھے، تجزیۂ نفسی کی [illegible] پر بھی اثر انداز ہوئے۔

آزاد تلازم کے طریقے سے کیا حاصل ہوا؟ اس کا جواب یہ ہوگا کہ پُرانی دبی ہوئی خواہشات اور واہمات کی یادیں۔ اس قسم کی یادوں کو شعور میں لانے سے مریض کا مرض بسا اوقات دُور ہو گیا۔ اس لیے فرائیڈ نے یہ سوچا کہ ذہنی مرض یا عصبانیت کی وجوہات وہ تاثرات ہیں جو اُس نے بچپن میں قبول کیے۔ چنانچہ اُس نے نفسی حقیقت کے اسباب و علل عہدِ طفلی کے تجربات میں ٹٹولنے شروع کیے اور اس سے نفسی جبریت کا تصور استخراج کیا۔

یہاں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ فرائیڈ کے ذہن میں دو نمونوں کا تصادم نظر آتا ہے۔ ایک نمونہ تو 'پوشیدہ شہزادہ' کا نمونہ ہے اور وہ یہ کہ مریض تجزیۂ نفسی کے دوران سچ بولنا چاہتا ہے، لیکن داخلی دفاع کی وجہ سے رُک جاتا ہے۔ یہ داخلی دفاع کیا ہے؟ داخلی دفاع وہ تمام خارجی عوامل ہیں جو بچپن میں مریض پر اثر انداز ہوئے اور اُسے بظاہر گھناؤنی شخصیت بنا دیا، حالانکہ حقیقت میں وہ صداقت پسند اور نِکو فطرت ہے۔ اسی لیے بعض اوقات یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ فرائیڈ کے نزدیک سائنس دان کا نمونہ بھی بہت اہم تھا۔ سائنس دان حقیقت کی تلاش کرتا ہے اور اس راستے میں اسے جو مشکلات و مصائب پیش آتی ہیں وہ جوانمردی سے اُن کا مقابلہ کرتا ہے۔ انسان کی حقیقت تو حق پسند ہے۔ لیکن سماج اسے گمراہ کر دیتا ہے۔ یہ داخلی دفاع مضر خارجی اثرات کو شخصیت میں سمو دینے سے پیدا ہوتا ہے۔ لیکن جس طرح ایک بھیانک شخص شہزادی کے بوسے سے شہزادہ بن جاتا ہے اسی طرح ماہرِ تجزیۂ نفس کی حریت پرور محبت سے مریض اس دفاع پر قابو پا سکتا ہے۔

دوسرا نمونہ یہ ہے کہ جونہی انسان کو اپنی خامیوں کے ماخذ اور اسباب کا شعور ہو جائے، وہ بہتر ہو جاتا ہے۔ یہ نمونہ اکثر ماہرینِ تجزیۂ نفسی کے فکر و عمل پر حاوی ہے۔ حالانکہ فرائیڈ نے اپنی زندگی کے آخری حصہ میں 'تجزیۂ انا' پر بھی زور دیا تھا۔ تجزیۂ انا سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مریض کو اس کی دبی ہوئی خواہشات کا شعور دلانا ہی کافی نہیں، بلکہ اس کی 'انا' کی تعلیم و تربیت بھی [illegible] ہے۔ یہ وہی منزل ہے جسے 'رنگ سے تبدیلی' [illegible]

میں نے ابھی یہ کہا تھا کہ فرائیڈ کے ہاں سائنس دان کا نمونہ بھی ملتا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ وہ کون سا سائنس دان ہے؟ معلوم یہ ہوتا ہے کہ یہ سائنس دان طبیعیات اور کیمیا کا ماہر ہے، جو واقعات اور اشیاء کے عناصر کو ڈھونڈتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ یہ عناصر ان چیزوں کی حقیقت ہیں۔ فرائیڈ کے ہاں بھی ہمیں یہ رجحان ملتا ہے، فرائیڈ بھی یہ کوشش کرتا ہے کہ ہر ذہنی واقع کو اس کے عناصر میں تحلیل کر دے۔ اور یہ عناصر اسے لاشعور میں دبی ہوئی خواہشات میں مل جاتے ہیں۔ ہر ذہنی واقعہ کی ایک ہی سمت ہے، حال سے ماضی۔ ہر ذہنی واقعہ کی نوعیت اِس طرح ہے کہ اسے ماضی کے ذہنی واقعات میں ڈھال دیا جائے۔ ایک لحاظ سے یہ نظریہ درست بھی ہے کہ کسی ذہنی واقعہ کی شکل اسی صورت میں بنتی ہے، جب ماضی کے واقعات اس کا پس منظر بنیں۔ اسی طرح تشکل Configuration مکمل ہوتا ہے۔ خواب کا کوئی ٹکڑا لیجیے اور اس پر آزاد تلازم کیجیے۔ دیکھیے کہ بسا اوقات کس طرح یہ ٹکڑا یادوں اور خواہشوں کے ساتھ منطبق ہو جاتا ہے اور زندگی کی ایک وضع Pattern کو نمایا کرتا ہے۔ ایک ٹکڑا دوسرے ٹکڑوں سے جڑ کر ایک پُر معنی شکل پیش کرتا ہے۔

لیکن یہ شکلیں کچھ مشکلیں پیدا کرتی ہیں۔ ان میں ایک ناتمامی کا سا احساس ہوتا ہے۔ ان میں ایک سمت یعنی 'حال سے مستقبل' موجود نہیں۔ جب کسی شکل میں مقصد کو شامل نہ کیا جائے تو وہ نامکمل رہتی ہے۔ لیکن چونکہ فرائیڈ ماہرین طبیعات اور کیمیا کو اپنا نمونہ بنا چکا ہے اس لیے مقصد کو من حیث المقصد اپنی تشریح میں شامل کرنا اس کے نزدیک ایک غیر سائنسی روّیہ کا اظہار ہے۔ چنانچہ اس کے ہاں ہر ذہنی شعوری واقعہ جس میں مقصد شامل ہوتا ہے تشریحی سطح پر مقصد سے خالی ہو جاتا ہے۔

یہاں ہم فرائیڈ کے تجزیۂ شخصیت کا ذکر کرنا چاہتے ہیں تاکہ مقصدیت کی مشکل زیادہ واضح ہو جائے۔ فرائیڈ کہتا ہے کہ ہر شخصیت تین اجزا پر مشتمل ہے:

(۱) لاذات

(۲) انا

(۳) [illegible]